"شاعرِ انقلاب"
نظریاتی و تنقیدی مطالعہ
ڈاکٹر عالیہ امام

"شاعرِ انقلاب"

نظریاتی و تنقیدی مطالعہ

از

ڈاکٹر عالیہ امام

انتساب

حضرت جوش ملیح آبادی کی پرستار

ادیبوں کی قدرداں

کنبے کی رونق

بوا (مسز میجر زیدی) کے

پیار کے نام

عرضِ ناشر

ادارے نے مختلف موضوعات پر اب تک جتنی کتابیں شائع کی ہیں وہ نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ اردو زبان کی بہترین کتابوں میں انکا شمار ہوتا ہے۔

تنقید کھرے اور کھوٹے سکے کو پہچاننے کی کسوٹی ہے۔ جس میں حسن و کثافت کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس لئے ادارے نے اپنی توجہ بہترین قسم کی نظریاتی و تنقیدی اشاعت کی طرف مبذول کی ہے۔

آج ادارہ برصغیر کی ممتاز دانشور و ادیبہ ڈاکٹر عالیہ امام کی تصنیف "شاعرِ انقلاب" پبلش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ ادبی، سیاسی دنیا میں تخلیقی رکھ رکھاؤ اور حکیمانہ ہمہ گیری کی علامت ہیں۔ ادب میں مقصدیت، وابستگی اور جانبداری کی قائل ہیں۔ حضرت فیض احمد فیض نے انہیں شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے "طوطیِ پاکستان" کا خطاب عطا کیا تھا۔ اور حضرت جوش ملیح آبادی نے "قلم کی شاہزادی" کے لقب سے نوازا تھا۔ اس کتاب میں مصنفہ نے حضرت جوش کے ذہنی سفر کا تنقیدی و نظریاتی مطالعہ انتہائی اچھوتے اور نادر انداز میں کیا ہے۔ یقین ہے کہ مصنفہ کی یہ کتاب بھی انکی دوسری کتابوں کی طرح مقبولیت حاصل کریگی۔

ہدیۂ تشکّر

عشق کا الاؤ حالات کی سرد مہری اور ماہ و سال کی گرد سے کجلا جاتا ہے لیکن ذہنی رفاقت کی آگ تا حیات دہکتی رہتی ہے۔ ممتاز دانشور ابرار نقوی (ممبر سنیٹر بورڈ آف ریویو) حضرت جوش ملیح آبادی کے صرف رتبہ داں ہی نہیں بلکہ انکے ذہنی رفیق بھی ہیں۔ ابرار صاحب کا مطالعہ ہمہ جہت ہمہ گیر ہے۔ ان کے تفکر میں رچاؤ، تجربے میں گہرائی اور جذبے میں بھرپور خلوص ہے۔ حبِ وطن، دردِ غربت، جورِ اغیار، مہرِ احباب، غمِ دل، فکرِ جہاں، غرض انسانی برادری کے رشتے انکے یہاں گہرے اور استوار ہیں۔ انکی ذکاوتِ احساس اور انسانیت سے بھرپور محبت کڑی دھوپ میں چاندنی اور کانٹوں میں پھول کھلانے کی متلاشی ہے۔ ابرار نقوی صاحب اور جوش صاحب کے دربار کے نورتن خورشید علیخاں کا پر خلوص اصرار اس کتاب کی اشاعت کا محرک بنا۔ میں ممتاز حیدر رضوی اور علم و یقین کی تنویر حمایت علی شاعر، پروفیسر علی رضا حسینی، نصیر ترابی اور فارسی کی ممتاز ادیبہ عطیہ نقوی کی بھی ممنون ہوں جنکی تابانیٔ فکر میری مشعل راہ بنی مجھے اپنی کم مائیگی و کم نگہی کا احساس ہے۔ پھر بھی میں یہ حقیر سی کاوش اپنے چمن کی مہکتی کلیوں، نوشگفتہ پھولوں، اور اجالا ذہن رفیقوں کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

فہرست

پیش لفظ

تمام فنونِ لطیفہ کی طرح اعلیٰ شاعری کیلئے بھی فلسفہ و تاریخ کے مطالعے کے ساتھ ساتھ سائنٹفک نظریئے کو اپنانا ضروری ہے۔ کیونکہ فلسفیانہ گہرائی فن کو درجۂ کمال تک پہنچاتی ہے۔ فلسفہ شاعر کے شعور کا جزو بنکر عملی زندگی کی صداقتوں کو اسباب و علل کی کڑیاں جوڑ کر نمایاں کرتا ہے۔ چونکہ فلسفہ بھی ادب کی طرح معاشی بنیادوں پر وجود میں آتا ہے اس لئے ادب کو بھی رومانی انداز کے ساتھ ساتھ ادراک کے طریق سے گذرنا لازم ہے۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اس عہد میں حضرت جوش کا شعور سب سے زیادہ جاندار، اور انکی فکر سب سے زیادہ متحرک ہے۔ ان کا متحرک ہونا یہ ہے کہ وہ زندگی کے اصلی چشموں سے پانی کھینچتے ہیں جنکی جولانی کبھی نہیں رکتی جنکی اثر انگیزی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اردو ادب کی دنیا میں حضرت جوش وہ پہلے انقلابی شاعر ہیں جنکی فکر کی بنیاد فلسفہ تغیر اور عقل پرستی پر قائم ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کا کوئی رخ دھندلا نہیں، کوئی پہلو برف سے ڈھکا نہیں۔

جوش کی ابتدائی زندگی کے نقوش ہوں، یا غرورِ حسن کا بانکپن، نادمیدہ جھرنوں کے بدن ٹوٹنے کا کرب ہو، یا فصلِ گل کیلئے تیرگی آہنی میت اٹھانے کا عزم زاہدانِ کذب و ریا سے صف آرائی ہو، یا رنگینیٔ چمن کی خاطر فرنگیوں سے آتشِ پیکار، ابتدا سے انتہا تک افکار میں داخلی ربط اور تسلسل ہے جو کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ جذبے کے خلوص، بیان کی صداقت، اعلیٰ مقصد کی لگن کے ساتھ حضرت جوش زمین پر قدم جمائے فلسفہ تغیر کی مشعل سے عقیدوں کی پھپھوندی ہٹانیکی جرأت تحقیق

عطا کرتے ہیں۔ عقل کی میزان پر ہر تغیر پذیر لمحے کو تو لتے ہیں امتحان کے کڑے کوس طے کرتے ہیں تاکہ رہ بتاں میں بصیرت و بصارت کے چراغ جل اٹھیں۔ جہل کے جھکڑ بادِ صبا میں تبدیل ہو جائیں۔

حضرت جوش کی رعنائی فکر و نظر رنگِ جلد بدن، رنگِ سوز گلو اور رنگ لختِ جگر کی قیود سے آزاد ہے۔ وہ انسانوں کو خانوں میں تقسیم نہیں کرتی۔ وہ حدیں کھڑی نہیں کرتی بلکہ انہیں ڈھاتی ہے۔ بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پروتی ہے۔ وحدت انسانیت کا سریلا راگ "اکتارہ" کی سنگیت میں ڈھالتی ہے۔ ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے انسان کے ہجر مسلسل کو قربِ مسلسل میں بدل ڈالنا چاہتی ہے۔ اس طرح اپنا رشتہ غالب، حافظ، مایا کاؤسکی، ناظم حکمت پبلو فرودا، اور دنیا کی آوازِ حق سے جوڑ لیتی ہے۔ جو بجھے ہونٹوں کو آبِ حیات پلا رہے ہیں "بیتی ہوئی زندگی اور بجھے ہوئے بام و در میں امن و آزادی، اخوت و محبت کے دیئے جلانے کے متلاشی ہیں۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جسوقت برصغیر کی آزادی و انقلاب کی داستان مرتب ہوگی وہاں اگر جواہر لعل نہرو، گاندھی جی، ابوالکلام آزاد اور قائداعظم کی تحریریں اور تقریریں پڑھنا ضروری ہوں گی وہاں حضرت جوش کا گلگوں و قندیل صفت کلام بھی پڑھنا لازم ہوگا۔ ہو سکتا ہے سیاست داں خوشبوئے چمن کو مصلحتوں کی چوکھٹ پر اقتدار کی خاطر قربان کرتے نظر آئیں۔ لیکن حضرت جوش کا مصلحت ناآشنا و "خونچکاں،، قلم زر و جواہر کے نیچے دبی ہوئی سلب شدہ قوتِ احساس کو جگاتا، نفرت کی چلچلاتی دھوپ میں جرأت اظہار کی چاندنی چھٹکاتا، اور "حرف حق" کی سربلندی کے لئے عقل و خرد کی ناطاقتی سے ظلم، جہل، نفرت، عقیدہ اور خسروی کی پیشانی کو عرق ریز کرتا لب و دل کی گواہی دیتا نظر آئے گا۔ حضرتِ نے استقامت کی معجزہ سامانی کے ساتھ اندھیرے اور اجالے کو صرف دکھایا ہی نہیں بلکہ ادراک

کے طریق سے گزر کر اس کی درستگی اور نادرستگی کا تجزیہ بھی کیا۔ ان کے ذہن میں آزادی
و انقلاب کا تصور محض برق و رعد، شمشیر و نیزہ نہیں بلکہ صوت ہزار اور رنگینیٔ بہار
سے عبارت ہے۔ ان کے یہاں یہ سائنسی نگاہ اچانک پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس میں
نصف صدی پر محیط مشق و دریافت، خود شناسی اور عالم آگہی کا عطر شامل ہے۔
اس لئے ان کی متنوع شاعری میں داخلی و خارجی ربط، اور ذہنی و جذباتی وحدت قائم
ہے۔ حضرت جوش اپنے عہد کے صرف عکاس نہیں نقاد بھی ہیں۔ ترجمان نہیں مجاہد
بھی ہیں۔ مفسر نہیں مجتہد بھی ہیں۔

نبوت بخش خرد سے بیزار، اجتہاد کو کفر سے تعبیر کرنے والے سیدھے دستواں چھکلے دار
وقد آور الفاظ کے ناشناسا، لفظ و معنی کے شعور انگیز اشاروں سے بے بہرہ، قرطاس
کے میدان میں قلم سے کبڈی کھیلنے والے، ملاؤں کی طرح تنگ ظرف، "خوش نوائی"
سے نالاں، خرد بیزار، ذکاوت سوز، جہل افروز، کمیں گاہوں سے کتنے ہی تیر اتہام
برساتے رہیں لیکن حضرتِ جوش کا آہنی استدلال، شعلگیٔ فکر، اور سائنسی نگاہ کا
چراغ ہمیشہ لو دیتا رہے گا۔
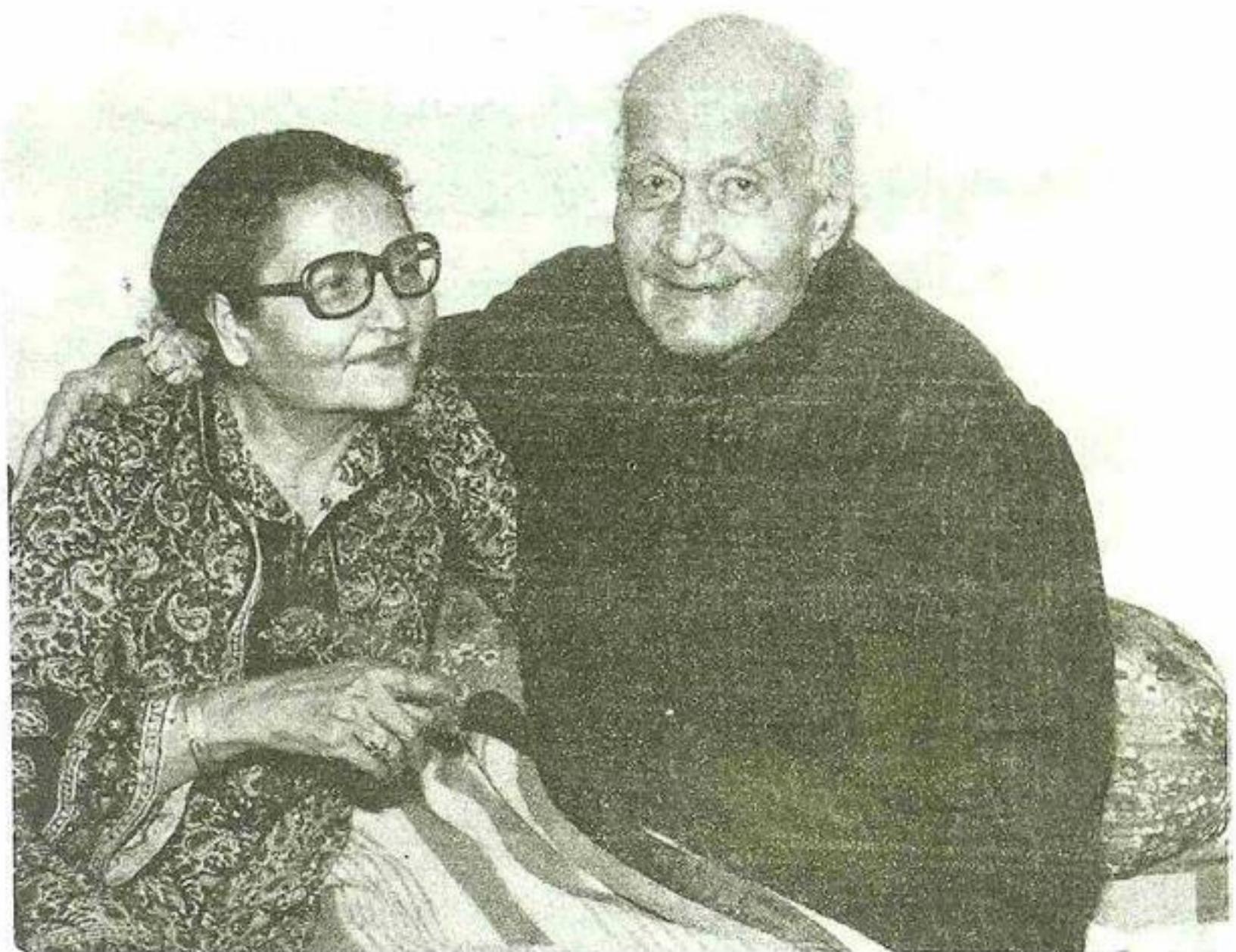
حضرتِ جوش ملیح آبادی ۔ اور ڈاکٹر عالیہ امام

ابتدائی نقوش

حضرت انسان کے متعلق یگانہ چنگیزی کا یہ شعر

شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ

انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

آبدار بھی ہے اور ہمہ گیر بھی — یہ انسان ہی تو ہے جو کہیں فرشتہ کہیں شیطان کہیں انسان کہیں حیوان ، کہیں موسیٰ کہیں فرعون ، کہیں سنگ و خشت ، کہیں دیدۂ بینا ، کہیں وہم وگمان اور کہیں لیلائے یقین بنتا ہے ۔ دونوں قسم کی شخصیتیں ماں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں لیکن دونوں دو مختلف رخِ حیات کی نشاندہی کرتی ہیں ۔

اس رخِ حیات کی آبیاری اور اس کی جہت کا تعین داخلی اور خارجی عوامل کرتے ہیں کیونکہ فنکار بہر حال سماج کے اندر ہی سانس لیتا ہے — اس کی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں طبقاتی رشتے ، فنی تصورات ، معاشرتی عقائد ، قومی روایات ، اور مختلف سماجی اور سیاسی تحریکات مواد فراہم کرتی ہیں ۔

فنکار کے ذہنی ارتقا کی مجموعی وحدت میں خاندان بھی مرکزی کردار ادا کرتا ہے جس کا اپنا مخصوص تصورِ حیات ، روایات کے پرکھنے کا پیمانہ ۔ اور اقدار کو جانچنے کی کسوٹی ہوتی ہے ۔ ساتھ ہی خاندان کی اپنی عطا کردہ پابندیاں اور آزادیاں بھی ہوتی ہیں — غرضیکہ ایک بنا بنایا تصورِ حیات ہوتا ہے جو شعوری اور غیر شعوری طور پر فنکار کے مزاج اور اس کی شخصیت کے خمیر میں گوندھ جاتا ہے ۔ ..... اور

یہ ایک ہمہ گیر دائرہ ہوتا ہے ـــــ تتلی کے رنگوں کی طرح جس کی تحلیل آسان نہیں۔
تاریخ کا جدلیاتی نظریہ معاشرے کو طبقات میں بٹا ہوا تسلیم کرتا ہے
طبقاتی معاشرے میں فرد کا تعلق یا بالائی طبقے سے ہوتا ہے یا متوسط اور نچلے طبقے سے۔
لیکن تاریخی طور پر کسی بھی مخصوص طبقے سے تعلق رکھنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس
مخصوص فرد میں طبقاتی شعور بھی ہو The dawning of consciousness
is inseparable from struggle یعنی فنکار کا منصب صرف
ساحل پر کھڑے ہو کر موجوں کا رقص دیکھنا نہیں بلکہ سمندر میں غوطہ زن ہونا بھی ہے
صرف مشاہدہ نہیں مجاہدہ بھی ہے ـــــ اس کے علاوہ اس میں گہری تاریخی بصیرت
ہو۔ تاکہ وہ طبقات کی آویزش اور کشمکش کا تجزیہ تمام سیاسی و معاشی عوامل کو سامنے
رکھ کر کر سکے ـــــ وہ اندھیرے اور اجالے کو صرف دیکھے نہیں بلکہ اس کی
درستگی اور نادرستگی کا تجزیہ بھی کرے اور ظلم کے گھپ اندھیرے میں سروں کے
چراغوں کی روشنی اور چاہت کی خوشبو ڈھونڈھ لے۔
اس کے علاوہ کسی بھی فرد کا کسی مخصوص طبقے میں پیدا ہو جانا اس بات کی
دلیل نہیں کہ وہ اپنے طبقے کے مفادات کا پاسبان ہو گا ـــــ بلکہ دیکھنا یہ بھی ہوتا ہے
کہ وہ فرد عملاً کس طبقے کے مفادات کا نگہبان ہے۔ آیا وہ معاشرے کو زرگری کی
گھاٹیوں میں اتار رہا ہے یا صورتِ گل پریشاں ہے۔ یا اپنے آہنی شعور و عمل سے معاشرے
کی مثبت اقدار اور زندہ روایات میں ہم آہنگی پیدا کر کے فکر کو مہمیز کر رہا ہے ـــــ
بدی سے صرف عدم مزاحمت کی تلقین کرنے کے بجائے جراتِ اظہار کی قوت بخش کر
تیرگی سے جہاد کا حوصلہ بیدار کر رہا ہے ـــــ کیونکہ طبقات کا صحیح ادراک اور بصیرت
مادہ کی نشو و نما، حرکت، ارتقا اور تغیرات کے اسباب و علل کو سمجھنے کا مطالبہ کرتا ہے
اکثر فنکار طبقاتی شعور رکھنے کے باوجود طبقاتی تجزیہ کرنے میں صحیح خطوط کی نشاندہی کرنے

سے قاصر ہوتے ہیں ——— یہ کیفیت دراصل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب طبقاتی جد وجہد تیز نہ ہو۔ طبقاتی تضادات ابھر کر سامنے نہ آئے ہوں ——— اس لئے انسان دوستی کے گہرے جذبے اور ترقی کی خواہش کے باوجود نظر تجزیہ کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

فن کار کے شعور میں شعلگی اگر کم ہوتی ہے تو وہ اپنے طبقے کی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں کی نذر ہو کر چارے دانے میں گرفتار اونٹ کی ڈھیلی رسی بن جاتا ہے جو جہاں چاہے اپنی طرف ہنکالے جائے ——— لیکن اگر شعور قندیل صفت ہے ——— وہ ساکن کو متحرک، متحرک کو متلاطم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ سماجی شعور social concious consciousness کی تربیت بھی کرتا ہے اور intellect ذہن فعال کا جزو بن کر سماج پر گہرے نقش ثبت کر کے اسے خوش آئند مستقبل کی راہ دکھاتا ہے۔

فرد کا شعور تاریخی تقاضوں کا مرہون منت ہے۔ اس کا تدریجی ارتقا ہوتا ہے۔ شعور کی تشکیل میں دوسرے اور عوامل کے علاوہ خاندانی خصوصیات بھی محبت کے مدہم راز کی طرح دھیرے دھیرے اپنی جگہ بنالیتی ہیں۔ جو لاکھوں پردوں میں نہاں ہو کر بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ انسان کبھی اپنی خاندانی صفات پر نازاں رجز پڑھتا نظر آتا ہے اور کبھی انہیں سے شاکی ہو کر علم بغاوت بلند کرتا ہے لیکن اس ذہنی کشمکش کے باوجود نفسیاتی طور پر یہ ذرا مشکل ہوتا ہے کہ فرد یکسر اپنی جڑوں سے رشتہ کاٹ لے اور گیہوں کے خلاصے کی طرح باہر نکل آئے۔

جوش ملیح آبادی کے بنیادی تصورات اور شاعری کے عوامل کو سمجھنے کے لئے ان کی نفسیاتی اساس اور شعور کی بنیادوں کو تلاش کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر کن عوامل سے ہوئی ہے؟ اور یہ شخصیت اپنے گرد و پیش کو کس طرح متاثر

کرتی ہے؟ کس طرح اس سے اثر قبول کرتی ہے؟ اور یہ اثر پذیری جب ان کے علم و فن سے متعلق ہو جاتی ہے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کس حد تک ادبی اور فنی رشتے ان کی شخصیت کی تعمیر میں ممد و معاون ہوتے ہیں؟ اور کس طرح یہ شخصیت ادب اور فن کو متاثر کر کے اس کے لئے نئی راہیں پیدا کرتی ہے؟ اور اسے نئی روشنی عطا کرتی ہے اور کس طرح یہ نئے راستے اور نئی روشنی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے؟

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا اس سے انکار ممکن نہیں کہ شخصیت کی تراش خراش میں طبقاتی نظام اور طبقاتی شعور کو بہت بڑا دخل ہے اس لئے کہ انہیں طبقاتی روابط سے ایک مخصوص دائرہ فکر اور اقدار کا مخصوص تصور ابھرتا ہے۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے اگر خود جوش صاحب کی تخلیقات سے مدد لی جائے تو ان کی پیچیدہ شخصیت کے پیچ و خم کو سمجھنا قدرے آسان ہو جائے گا۔

جوش صاحب کے والد کا نام نواب بشیر احمد خاں، دادا نواب محمد احمد خاں پر داد فقیر محمد گویا اور سگڑ دادا محمد بلند خاں تھے۔ جوش صاحب کے دادا امام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد گویا جن کا شمار شعراء اودھ کے صف اول کے شعراء میں ہوتا تھا اور دیوان گویا ان کا مجموعہ کلام ہے اپنے والد کے ساتھ درۂ خیبر سے گذر کر ہندوستان آئے اور پٹھانوں کی مشہور بستی قائم گنج ضلع فرخ آباد میں ۱۲۲۴ء میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ نواب محمد امیر خاں والئ ٹونک کے عہد ٹونک گئے اور اس کے بعد نواب فقیر محمد خاں گویا ملیح آباد آگئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی "ہمارا وطن تہذیبی جنت یعنی لکھنؤ سے فقط تیرہ میل کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے... ہندوستان آکر بھی ہم نے جنگ جوئی کی عادت نہیں چھوڑی.... ہمارے خون میں

درۂ خیبر کی شعلہ بار دھوپ مچلتی رہی اور ہمارے سروں پر اودھ کی سلونی شامیں گلباریاں کرتی رہیں۔"
(" یادوں کی بارات ، صفحہ ۲۴۹)

اس اقتباس سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اول تو یہ کہ جس طرح غالب کو اس بات پہ ناز تھا کہ

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

اس طرح نسلی افتخار کی گونج جوش صاحب کے یہاں بھی مختلف انداز سے سنائی دیتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ ان کی شخصیت کے خون میں یہ مچلتی ہوئی دھوپ اور ان کے جذبات میں اس گرمی کی شدت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں میر کی سی نرمی اور شبنمی انداز کم نظر آتا ہے اور بلند بانگ شخصیت کی گونج زیادہ سنائی دیتی ہے لیکن چونکہ انہوں نے اپنی "بچھونی" کا گلہ دبایا تھا اس لئے سینے پر محبت کا جھرنا تمام زندگی بہتا رہا۔

جوش صاحب کی زندگی جس گھرانے میں بسر ہوئی " وہاں ہر طرف روشنی تھی۔ چہل پہل لونڈیاں ، باندیاں ، ماماکیں ، اصیلیں ، راتوں کو کہانی سنانے والیاں ، ...... ہر طرف خدمت گاروں ، رکاب داروں ، ساہوکاروں اور کارندوں کا ہنگامہ تھا .... رعایا ہم دونوں بھائیوں کے پاؤں چھو چھو کر نذرانے دینے لگی۔ اور ہم نذر کے روپیوں کو بے پروائی سے کھنا کھن چھنا چھن پھینکنے لگے .... " ایضاً ص ۱۰۱

اپنے طبقاتی روابط کی بنا پر جوش صاحب ایک طفیلی یعنی جاگیردار طبقے کے فرد تھے جو دوسروں کی محنت پر ڈاکہ زن ہو کر تجوریاں بھر رہا تھا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس طبقے کے مفاد کے اگر وہ نگراں اور پاسبان ہوتے تو تعجب کی بات نہیں تھی لیکن

قندیل صفت شعور کی پختگی و شعلگی اور اس طبقے کے اندرونی گھناؤنے کردار کو جاننے اور ان کے مظالم سے آگاہ ہو سکی بنا پر انہیں اس طبقے سے نفرت ہے جو آگے چل کر ان کی انقلابی شاعری کی بنیاد بنتا ہے۔

جوش صاحب تعلیم کے رسمی معیار کے مطابق سند یافتہ نہیں تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھا ضرور۔ لیکن حالات کی سخت گیری آڑے آئی اور تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ حصولِ علم کا چسکا لڑکپن ہی سے لگ چکا تھا۔۔۔ جوانی کی اندھیری راتوں اور برساتوں میں بھی۔۔۔ میرے دن کتابوں کے مطالعے۔۔ شعر کی تخلیق اور علماء اور شعراء کی صحبتوں میں بسر ہوتے تھے "(ص ۲۱۲ ایضاً)

چنانچہ نو برس کی عمر میں شعر کی دیوی نے مجھ کو آغوش میں لے کر مجھ سے شعر کہلوانا شروع کیا (صفحہ ۱۳۲) مگر باپ کو پٹھان بیٹے کی شاعری پسند نہ آئی جس کے نتیجے میں خاصی پٹائی ہوئی جیب خرچ بند ہو گیا (ص ۱۳۳) میں اس کشمکش میں پڑ گیا کہ اپنی فطرت کا حکم مانوں یا اپنے باپ کا خارجی فرمان قبول کروں۔۔۔ لیکن باپ کے اس حکم امتناعی کے باوجود شعر گوئی ترک نہ ہو سکی۔۔۔ بالآخر شعر گوئی کی اجازت ملی بھی تو اس وقت جب چوری پکڑی گئی۔ اشعار کے کاغذات پھاڑ دیئے گئے، جس کے نتیجے میں ایک دردناک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا۔۔۔ میری ماں دیوانہ وار مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں میاں کے حواس اڑ گئے" (ص ۱۴۴) (یادوں کی برات)

گو یہ واقعات کمسنی کے ہیں لیکن یہاں ایک بات واضح ہے کہ جبر و تشدد خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو، ذہن کو جبر کے خلاف تیار کر رہا تھا۔ اعصابی قسم کا دباؤ محسوس ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ذہن ستاروں کا مشاہدہ" بھی کر رہا تھا۔ ان کی چمک دمک کا راز پا لینے کے لئے بھی بے تاب تھا۔ تحیر و تجسس کا یہی جذبہ نکھر کر ان کی اعلیٰ فکری شاعری کے لئے مواد فراہم کرنے کو تھا۔

جوش صاحب کی شاعری کے محرکات کو معلوم کرنے کیلئے ان کی "محبوعہ اضداد" شخصیت کے نہاں خانے میں اترنا ضروری ہے۔ "میں بچپن میں کیا تھا؟ شعلہ تھا یا شبنم؟ ـــــ ایک رخ میں تو اس بلا کا سریع الاشتعال کہ ذراسی بات میں آپے سے باہر ..... دوسرا رخ اس قدر مہر و وفا سے لبریز کہ دوسروں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ..... جب میں ماسٹر بن کر اپنا پڑھایا ہوا سبق ساتھ کے بچوں کو پڑھاتا اور وہ دوسرے دن اسے دہرا نہ سکتے تو ان کو ڈنڈوں سے پیٹتا .. صفحہ ۳۴ دوسری جانب شبنمی مزاج اس بلا کا کہ مہمان رخصت ہونے لگتا تو آنکھیں آنسو برساتی ..... جو لوگ ریل میں ہمسفر ... یا گانے بجانے کی محفلوں میں میرے ندیم ہوتے ..... ان سے بے پناہ محبت ہو جاتی ...... بشیر محمد خاں جب مجھ سے لپٹ جاتا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیتا ...." صہ ۳۶۔

ایسی شخصیت فن کے میدان میں ظلم کے سامنے شعلہ اور انسانیت کے سامنے شبنم بن کر آئے تو تعجب کی بات نہیں۔

جوش صاحب کا گھرانہ مذہبی تھا ..... "ابتدا میں میں نے مذہب کو صرف سینے سے ہی نہیں لگایا .... بلکہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی بھی کی ..... یہاں تک کہ ڈاڑھی بھی رکھ لی۔"

جوش صاحب کی طرح ٹیگور کا تعلق بھی مالدار گھرانے سے تھا۔ گھرانے کا مزاج مذہبی تھا چنانچہ میرا بائی کے بھجن، اشلوک، اپنشد ان کی زندگی کی ٹھوس حقیقت بنے۔ جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے۔

"میرے نزدیک مذہب ایک بے حد ٹھوس شئے ہے ..... میں نے یہ مالکو محسوس کیا ..... میں نے یہ جلوہ پرندوں، جانوروں، خاک اور مٹی سے حاصل کیا اس کے عکس کو آسمان میں ہوا میں، پانی میں محسوس کیا .. ایسے لمحات آئے جب

ساری دنیا مجھ سے باتیں کرتی ۔ ۔ ۔" غالباً یہی وجہ تھی کہ ٹیگور کی فکر تمام زندگی اپنے زمانے کی مادی حقیقتوں سے مطابقت پیدا نہ کر سکی ۔ وہ فطرت ابدی روح کی آوارہ گردی انفرادی آزادی کی تلاش میں تمام عمر سرگرداں رہے ۔ ان کے نزدیک "خارجی اشیا" جو مادی زندگی کا بلاواسطہ اظہار ہوتی ہیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں ۔ بیشتر اوقات انہوں نے مبہم طریقے پر انسانی قدروں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کے یہاں قوت محرکہ و قوت حیات کا فقدان ہے ان کی اکثر نظمیں اس دعا کی بازگشت ہیں ۔ جس میں خطاب قادر مطلق ہی سے ہے ۔

"تو مجھے عزت بخش

تاکہ میں ان بیڑیوں سے آزاد ہو جاؤں جنہوں نے ہمارے ذہن کو جکڑ رکھا ہے ۔

ہماری اس صدیوں کی پرانی شرم کو منتشر کر دے ۔

اور ہمارے سر کو بلند کر دے

دریا دل ضیا تک

آزادی کی فضا تک "

اقبال نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں مذہب کا زور تھا۔ مولانا روم سے اقبال کی والہانہ محبت ان کے والد ہی کی دین تھی جنہیں مولانا سے گہری عقیدت تھی۔ گھرانے کے مخصوص مزاج اور دیگر عوامل نے اقبال کے سینے میں اسلام کی شمع روشن کی جو تاحیات جلتی رہی ۔ اقبال اپنی غیر معمولی ذہانت کے باوجود ماضی کے اسلام کی شان و شوکت کی مرعوبیت کے اسیر رہے ۔ مستقبل کو درخشاں اور تابندہ بنانے کے لئے وہ ماضی کی طرف دیکھتے رہے مسلمانوں کی بے عملی اور رہبانیت کی بنیادی وجہ انہیں یہ نظر آئی کہ مسلمان اسلام کے زریں اصول فراموش کر بیٹھے ہیں ۔ افلاطونی تصور پرستی نے مسلمانوں میں انحلال پیدا کر دیا ہے جس نے نفی خودی کو جنم دیا ہے چنانچہ اس کے خلاف انہوں نے انتہائی بلند بانگ انداز میں نظریۂ

خودی کو پیش کیا جو عہدِ ماضی کو واپس لاسکتی ہے اور انسان کو " نیابت الہٰی " کے درجے پر پہنچا سکتی ہے۔

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ اقبال اور ٹیگور کی طرح جوش صاحب نے بھی مذہبی گھرانے میں جنم لیا۔ ہر جانب مذہبی " امن و آشتی " کی فضا پائی۔ جوش صاحب کے باپ نے بقول ان کے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کہ " مجھ کو وہ " بنا دیں۔ ۔ ۔ "میں مطرب کو چھوڑ کر موذن سے دل لگاؤں۔ ۔ ۔ مکھڑے کے تلوں سے نظر پھیر کر تسبیح کے دانے گھماؤں

اور سفید ڈاڑھیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ "

لیکن ان سختیوں کے باوجود ذکاوت ہر خشت کو گلا کر سونے کا ڈلا بنانے کے لئے بے چین تھی ۔ ۔ ۔ " میں نے محسوس کیا کہ ذہن کی کمانیاں کھل رہی ہیں " جب میرے راسخ العقیدہ باپ تک یہ خبر پہنچی کہ میں بعض " مسلمات " کا مذاق اڑاتا ہوں تو انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور فرمایا کہ مجھے اس کا خوف پیدا ہو گیا ہے تو آگے چل کر گمراہ ہو جائے گا" چنانچہ اسی بنا پر مجھے جائیداد سے محروم کر دیا۔ ۔ لیکن آخر میں ان کا دل پسیجا اور انہوں نے فرمایا " شبیر اس دولت و جائیداد کی خاطر تو لوگ ماں باپ، بہن بھائی کو مار ڈالتے ہیں ایمان گنوا دیتے ہیں۔ مگر تم نے اس دولت اور جائیداد کی پرواہ اپنے اصولوں کے سامنے نہیں کی۔ مجھے تمہاری استواری اور استقامت بہت پسند آئی ۔ ۔ ۔ اگر تمہارا سا آدمی مجوسی بھی ہو جائے تو عزت کرنا چاہیئے " ۔ ۔ ۔ (روحِ ادب ص ۱۲-۱۱)

دھکتا ہوا ذہن اپنے طبقے کی فرسودہ فکر، روایتوں میں گندھی ہوئی زندگی اور آبا و اجداد کے تراشے ہوئے اصنام کو سینے سے لگانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کہنے کو تو خاندان کا بنا بنایا تصورِ حیات اور باپ دادا کا صنم محض واہمہ اور خیال ہی ہوتا ہے لیکن ہر قدم میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ پیکرِ شیریں تراشنے کے لئے روایات کے پہاڑ کا سینہ چاک کر دے۔ گلستاں کو سنوارنے کے لئے رسم و رواج کے کانٹوں سے الجھ جائے

پرانے دفرسودہ خیالات کو پاش پاش کر کے نئے خیال، اور نئی دنیا کی تعمیر کرے اور ہر بت کو راستے سے ہٹا دے کیونکہ پرانے بت کو توڑنے میں غور و فکر اور عمل کی ساری نوعیت بدل جاتی ہے۔

جوش صاحب کی لڑکپن کی یہی نفرت آگے چل کر ان کی سیاسی نظموں کے روپ میں شعلہ فشاں ہوتی ہے۔

جوش صاحب کی شاعری کے محرکات سے بحث کرتے ہوئے ایک پہلو بہت اہم ہے وہ محبت کا شدید جذبہ ہے۔ جو ان کی عشقیہ شاعری کی بنیاد بنتا ہے۔ ابتدا میں وہ افلاطونی محبت کے رسیا نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کی فکر صورتِ گل پریشاں ہے۔ جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

"میں محبت کو جنسیات سے برتر ایک مقدس آسمانی چیز سمجھتا تھا.....
اور محبت کی تلخ شیرینیوں میں گم ہو جانے کو حیات انسانی کا سب سے بڑا کارنامہ خیال کرتا تھا" روح ادب۔ ص۱۱

جوش صاحب کی حریت فکر نے جس طرح ہر مقام پر آزاد خیالی کو اپنایا اور بت شکنی کی اس طرح حالات کی زد پر آ کر ان کی افلاطونی محبت کا چراغ بھی لو دے گیا اور طور در آغوش عشقیہ شاعری وجود میں آئی جو آگے چل کر ادب کا درخشاں باب بنی۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا جوش صاحب کی زندگی کا بہت المناک واقعہ تھا۔ ڈیوڑھی کی رونق افسردہ ہوتے ہی جگمگاتا ہوا گھر بے چراغ ہو گیا۔ قہقہے ٹوٹ گئے۔ مزاج کی شگفتگی یاسیت میں بدل گئی۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ دل کی کلیاں مرجھا گئیں۔ آئینۂ ذات چکنا چور ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں رہبانیت نے دل و دماغ پر گھیرا ڈالا۔ اپنی ہی ذات پر نگاہ مرکوز ہو گئی۔ اپنا ہی غم سب سے بڑا نظر آنے لگا۔ "ترانۂ بیگانگی"، "گریۂ مسرت"، "طوفان بے ثباتی"، اسی دور کی یادگار ہیں۔ آنسوؤں کا قلزمِ ذخار زمانے سے اپنے

درد وغم کا اظہار اس طرح کر رہا تھا۔

تاریخ اٹھا تبلائے گی وہ دنیا میں خوشی کا نام نہیں
جس دل پہ ہوس کا سکہ ہے اس دل کے لئے آرام نہیں
اس شئے سے تعلق ہی کیا جو چیز کہ جانے والی ہے
سامان تعیش جمع کیے، جا موت بھی آنے والی ہے

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے" ایک حقیقت ہے اس لئے کہ سفر صرف حال نہیں ماضی اور مستقبل کی بھی سیر کراتا ہے۔ ٹھوس حقائق سے رشتہ استوار ہوتا ہے۔ دھندلے نقوش روشن، پرانی یادیں اجاگر اور مستقبل کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ اکثر ذہین انسانوں کے شعور کے سفر میں سفر سنگ میل بن گیا ہے۔

غالب نے کلکتے کا سفر کیا۔ ذاتی تجربہ وسیع ہوا۔ قدیم علوم کے مقابلے میں نئے علوم کی ماہیت واضح ہوئی۔ ذہن نے ان سازوں کی جھنکار سنی جنہیں مضراب نے ابھی ابھی چھیڑا تھا۔ صدیوں کی روایتی گرد جھاڑ کر" ذہن آزاد ہوا۔ افکار کو حرارت اور نغموں کو حرارت ملی۔ احساس میں ہزاروں سورج روشن ہوئے " آئین اکبری" کی تقریظ لکھنے کی فرمائش کو ٹھکرا کر "تقریظ آئین اکبری"، محجمہ سید احمد خاں لکھ ڈالی اور یہ بتا دیا کہ تاریخی بصیرت سے ناآشنا ذہن ماضی سے چمٹا رہتا ہے " کثرت نظارہ" "چشم تنگ" کو وا کرتی ہے سائنس کی برکات شعور د آگہی کو متحرک و متلاطم بناتی ہیں اور زندگی میں گلستاں اگاتی ہیں۔

جوش صاحب کے ارتقائے شعور کی مادی بنیادوں کو تلاش کرنے میں حیدرآباد کے سفر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حیدرآباد کا ماحول ریاستی تھا۔ جھلملاتی زرتار قبا، جمود، ٹھہراؤ، کھوکھلے قہقہے۔ ایک طرف سیم وزر کا بازار جو موسیقی، شاعری، خطاطی، نقاشی، سنگتراشی کو خرید کر اپنی انا کو تسکین بخشنے کے سامان فراہم کر رہی تھی دوسری

جانب روشنی کی ہتوں میں افسردہ تمنائیں ۔ تپتے ہوئے اونٹ ، اجڑے ہوئے خواب کچلی ہوئی جراءت ، ٹوٹے ہوئے ارمان ، بجھے ہوئے ماضی کے چراغ ، سازشوں کی بنگیں، امرار کی گرسنہ نگاہیں، اندھیرے میں سب کچھ ہو رہا تھا۔ ثقافت کے بازار کی ظاہری چمک دمک ادیبوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی ۔

جوش صاحب نے اپنے طبقاتی مزاج کے قطعاً خلاف قلم کو ذریعہ روزگار بنانے کی ٹھان لی یہی جذبہ لے کر وہ حیدرآباد گئے اور وہاں دارالترجمے میں ناظر ادب ہو گئے۔ حالات کی تبدیلی نے خیالات میں تغیر پیدا کیا ۔ مطالعہ یک جہت نہیں شش جہت ہوا۔ میر و غالب ، حافظ فردوسی ، گوئٹے و برگساں نٹشے اور مارکس بھی مطالعے میں آئے قدیم کے ساتھ جدید علوم سے آگہی ہوئی۔ دائرہ تخیل وسیع ہوا ۔ فکر میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی۔ حرف و حکایات کے معنی ابھرے ۔ آلام روزگار کی چلچلاتی دھوپ سے ٹکر لینے کا حوصلہ بیدار ہوا۔ فطری شگفتگی نے زندگی کو توانائی اور ذکاوت کو جولانی بخشی حریت فکر کے اکھوے پھوٹے ، جرات اظہار بیدار ہوئی۔ جو انہیں اپنے طبقے کی اخلاقیات سے باہر لائی ۔ **اخلاقی اقدار کی نوعیت بھی طبقاتی ہوتی ہے** ۔ شراب ، محبت ، سیاست زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان جو حجاب حائل تھا وہ دور ہوا محتسب زاہد و مفتی سے ٹکر لینے کی جھجک دور ہوئی ۔ محبت کے تصور میں تغیر آیا۔ سیاسی افق قدرے چمکا ۔ اور انقلاب کی ضرورت ہر سطح پر محسوس کی ۔ اپنے غم کے خول سے باہر سانس لی تو زمانے کا غم بہت بڑا نظر آیا۔ سیاسی سطح پر صحیح تجزیہ گو اس وقت بس میں نہیں تھا لیکن سماجی حالات پر نگاہ کی تو قوم کی مصیبت سامنے آئی ۔ بحالے کے سے بے باک حوصلے کے ساتھ ان کے غم میں اس طرح شریک ہوئے ۔

سلطان بڑھے ہیں دہر میں لشکر لئے ہوئے
اور ان کے ساتھ قحط بھی خنجر لئے ہوئے
اب حد کے اختیار میں قسمت نہیں رہی
ڈاکہ رہا ہے رسم تجارت نہیں رہی

یہ ایک حساس انسان کی آواز تھی جو پہلی مرتبہ بلند ہوئی تھی جو تپ کر کندن بننے کو بے چین تھی۔ یہ نظم ہندوستان کی عوامی امنگوں کا تخیلاتی سطح پر اظہار تھا۔

شراب کے باب میں "چند جرعے"، "پیامِ کیف"، وغیرہ نظمیں اسی دور کی پیداوار ہیں۔

بادہ ہے اس طرف ادھر کوثر
اس کو فاتح بنا اسے مفتوح
چشمہ زندگی ہو مدح سرا
ارغوانی شراب ہو ممدوح

محبت کے افلاطونی نظریے میں، محبت کے بٹن تو پہلے ہی ٹانکے جا چکے تھے حیدرآباد کی رومانی اور پُرکیف فضا میں وہ رنگ دو آتشہ بنا۔ محبت کے لئے اپنی سرگردانی پر پردہ ڈالنے کے بجائے جراءت اظہار کا یہ طریقہ اپنایا۔

مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لئے
چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس
زیب تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے

غرضیکہ متجسس ذہن تطہیر کی منزل پر تھا۔ حیدرآباد کی فضا انہیں "علم و فکر کا راستہ دکھا چکی تھی۔ کائنات کے مطالعہ پر مامور کر چکی تھی" جو تغیر پذیر اقدار کو

سینے سے لگانے کے لئے بے چین تھا ——— لیکن حیدر آباد کی سازشی فضا جوش صاحب کو راس نہیں آسکی ۔

ریاستی نظام کی ہر کروٹ میں سازشوں کے دام بچھے ہوئے تھے۔ جوش صاحب کا طبقاتی مفاد تو ریاست سے وابستہ ہونا چاہیئے تھا۔ ان کے طبقے کی تو عبادت ہی حکمرانوں کو دعائیں دیکر اپنی جھولیاں بھرنا تھا ——— لیکن جوش صاحب میر کے قبیلے کے فرد تھے۔ "سر کسو سے فرو نہیں ہوتا" کی منزل پر آچکے تھے۔ اپنے طبقے کی دیرینہ روایت کو چھوڑ کر حکمرانی کی نخوت کو ٹھوکر لگانے کا جذبہ بیدار ہو چکا ہوتا۔ چنانچہ "خداوندانِ اقتدار" کے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی مشہور نظم "غلط بخشی" سنا ڈالی اور یہی نظم حیدر آباد سے ان کے اخراج کا باعث بنی۔ حکمراں طبقے کا حرفِ حق کے سامنے تابیں مارنا اور گرد اڑانا لازمی ہے ۔

الٰہی اگر ہے یہی روزگار	کہ سینے رہیں اہل دل کے فگار
دنائت کو حاصل ہوں سرداریاں	شرافت کرے کفش برداریاں
سر بزم جہل آئیں اہل نظر	بشکل غلامانِ زریں کمر
سر محفل ممسکِ بد فعال	کریم آکے پھیلائیں دستِ سوال

جوش صاحب کی حق گوئی ریاست کے وجود پر بار بنی اور انہیں ۲۴ گھنٹوں کے اندر "فرمان" کے ذریعے نکال دیا گیا جس کا تفصیل سے تذکرہ انہوں نے "یادوں کی برات" میں کیا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ جوش صاحب کے قلم نے ریاستی نظام کے جھملاتے ہوئے پردوں کو چیر کر اس کے اصلی چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ۔ دربار ان کے طبقاتی روابط کے منافی تھی کیونکہ ان کے طبقے کی دیرینہ روایت حکمرانوں سے گٹھ جوڑ کرنا ظلم کا ساتھ دیکر مظلوموں کو تہہ تیغ کرنا تھا۔ یہاں جوش صاحب اپنی شعوری کوشش

سے اپنے طبقے کی فکر سے آزاد ہو کر سوچتے ہیں ـــــ لیکن اس کے باوجود ان کی نگاہیں اس تحریک کو جو ریاست کے وحشی نظام کے خلاف ہتوں سے اٹھ رہی تھیں۔ جس میں عوام شریک تھے انہیں نہیں دیکھ سکیں۔ اسی لئے ان کے یہاں اس کا تذکرہ نہیں ہے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس وقت طبقاتی تضاد گہرا نہیں ہوا تھا۔ مزدور تحریک کی رو تیز نہیں ہوئی تھی ـــــ پھر انسان کا ذہن جن سوالات پر غور کرتا ہے اس کا جواب وہ انہیں حدود کے اندر دے سکتا ہے جس میں وہ سانس لے رہا ہے اس میں شک نہیں کہ فکر آزاد ہے لیکن اس کی آزادی بھی سماجی حالات سے متعین ہوتی ہے۔

جوش صاحب کی اس دور کی نظموں میں نہ صرف تازگی بلکہ وسیع المشربی کا عنصر کھنکتا نظر آتا ہے جس کا سرچشمہ ظاہر ہے کہ ان کا جاگیردار طبقہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس طبقے کی فکر میں جمود ہوتا ہے۔ جمود ہوتا ہے تو ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ حرکت نہیں تو تعفن ہوتا ہے۔ تو پھر کونسی قوت تھی جو انہیں فرسودہ روایات، ریاستی نظام کے کھوکھلے پن اور استحصالی قوتوں کے خلاف آمادۂ جہاد کر رہا تھا۔ شاید اس کا جواب ان کا حقیقت نگر ادراک متغیر سیاسی و سماجی حالات اور متجسس ذہن دے رہا تھا۔
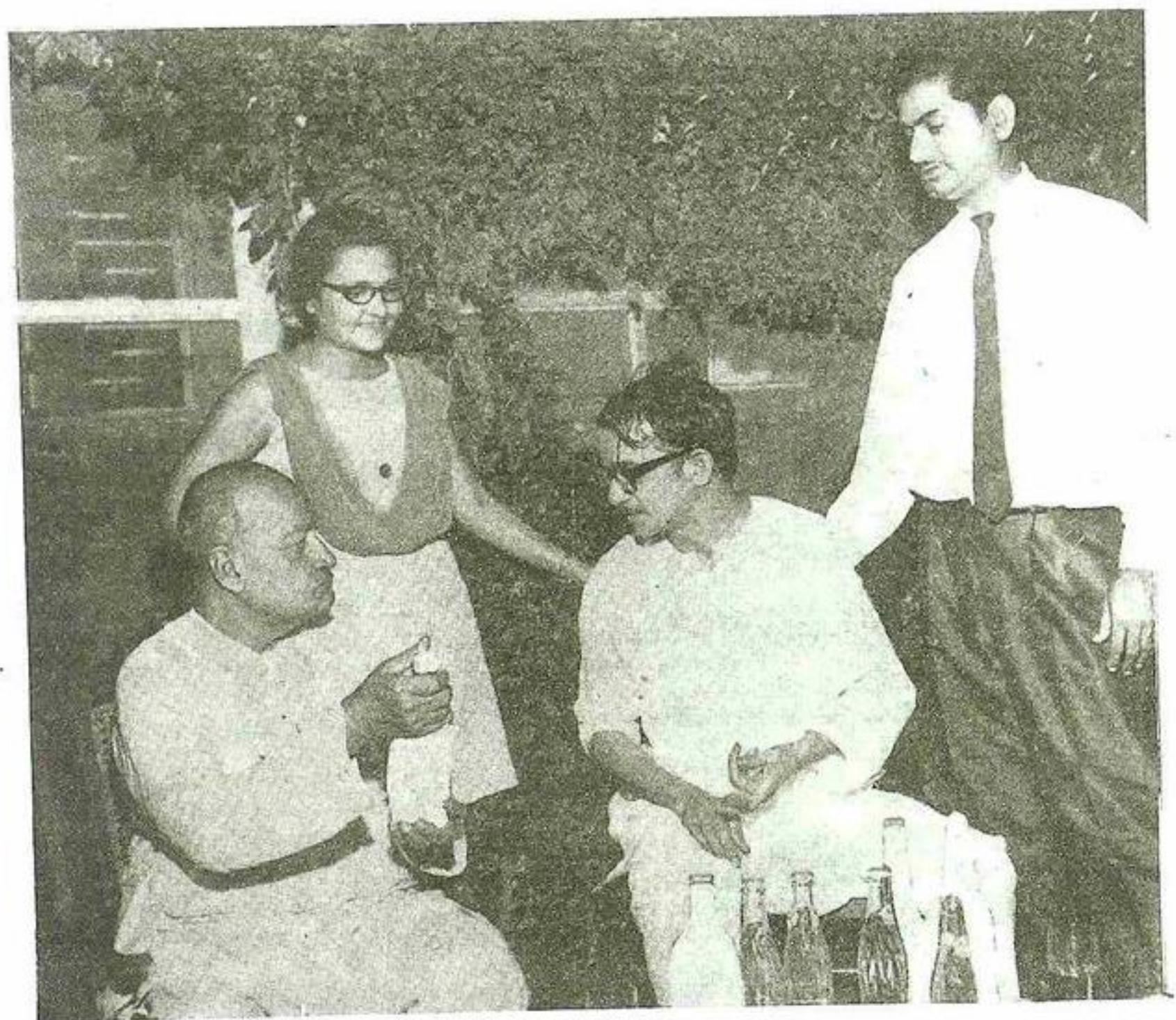
حضرت جوش ملیح آبادی ۔ ممتاز مصور صادقین ۔ سید کاظم امام

تصوّرِ عشق

جوشؔ صاحب نئے اقدارِ حیات کے متلاشی، رازِ زندگی کے جویا اور "خوب سے خوب تر" کے پرستار تھے۔ طبیعت کا یہی وہ خاصہ تھا جس نے انہیں پرانی اقدار کا باغی اور بت شکن بنا دیا تھا ان کی شاعری کا بنیادی محرک محبت کا جذبہ تھا۔ جس کی دلفریب وادی میں انہوں نے اس جذبے کی وسعت، اس کی عظمت اور آسمان کی سی رفعت دیکھی اس وادی میں کڑی دھوپ بھی تھی اور نرم رو دریا کی روانی بھی پُر شکوہ جھاڑیاں بھی۔ سرو قد سنگتروں کے درخت بھی ڈھلوان چٹانیں بھی اور جنگلی پھول بھی۔ بیلے کی کلیاں بھی اور سرمئی، بنفشی، یاقوتی مالائیں بھی۔

ابتدا میں محبت کا یہ جذبہ جیسا کہ کہا گیا "دور کا جلوہ" افلاطونی تقدس کا ہالہ، اور جوگی و بیراگی کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔ "میں محبت کو جنسیات سے برتر ایک مقدس آسمانی چیز سمجھتا تھا۔" "یادوں کی برات"

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مشرقی ادب کا بہت بڑا حصہ غم و الم کی لٹوں میں الجھا اور بنیادی بیراگ میں تپ رہا تھا۔ جن فلسفیوں نے ہندوستان میں جنم لیا انہوں نے جسم و روح کی دوئی کو تسلیم کیا۔ جسم کو خاک کے سپرد کیا اور روح کو فلک پر بٹھایا۔ جب جسم خاک میں ملا دینے کے لئے ہی ہو تو اسے کندن بنانے کی ضرورت نہیں۔ پوری زندگی صرف مایا جال نظر آنے لگی۔ تصوف اور بھگتی کے ان تصورات نے اپنی جڑیں گہری کیں ______ سیاسی افق پر بالائی طبقے کے ہاتھ میں یہ فلسفہ عوام کو غشی کی حالت میں رکھنے۔ قناعت و قنوطیت و تقدیر پرستی کی تعلیم

دینے کے لئے ایک خوبصورت ہتھیار کے طور پر ہاتھ آیا۔ ادب میں غم والم و قنوطیت و سیر دگی کی قبا پہن کر اس خیال نے اولیت حاصل کر لی۔ چنانچہ طویل عرصے تک انہیں تصورات کی حکمرانی ہمارے ادب پر رہی۔ جب تک پیداواری رشتوں میں نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔

تدبش صاحب کے تصور عشق پر نگاہ ڈالنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادب کی دنیا میں عشق کا تصور کیا تھا اس پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ عشق کا تصور زمان و مکان سے آزاد نہیں۔ جاگیردارانہ سماج میں عشق کی ذہنی عادت نقاب میں رہنے کی تھی۔ ـــــ چنانچہ مومن صاحب، کے نغموں کو پانے کے لئے بے چین و مدہوش رہے لیکن بے سود میر بھی "کھلنا کم کم" ہی کی منزل پر رہے۔ "معاملات عشق" اور ننگ نامہ، ان کے عشق کی مکمل داستان غم ہے ـــــ داغ کا مزاج ذرا آزاد واقع ہوا تھا۔ ان کا عشق کھلی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کوٹھے سے بھی شناسائی اور دوسرے انداز دلبربائی سے بھی ـــــ غالب کے عشق کا خمیر تشنگی و سیرابی سے اٹھا ـــــ ایک فتنے میں سو فتنوں کا سامان لئے ـــــ سپردگی جو میر کا طرۂ امتیاز تھا وہ یہاں ذرا کم ہے ـــــ پیکر نازنیں کی شوخی و رعنائی، لچک و موسیقیت پر وہ سو جان سے فریفتہ رہے۔

ہے ساعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

یا

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانی روش و مستیٔ ادا کہیے

لمس بدن کی وہ آرزو جس کے "مرقعے نسخہ حمیدیہ" کے ایک بڑے حصہ میں ہیں

ہے وصل و ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ عاشقِ دیوانہ چاہیے

یا یہ غزل "غنچہ ناشگفتہ" یہ نسخہ حمیدیہ، کی ۱۲۱ ویں غزل ہے قلمی نسخے کے حاشیے پر شکستہ خط میں چار شعروں کا اضافہ یوں ہے۔

گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

لیکن اس کے ساتھ خودنگری کا یہ عالم کہ

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

یا

جلوہ کن، منت منہ از ذرہ کمتر نیم
حسن با ایں تاب ناکی آفتابے بیش نیست

معاشی پیداداری رشتے سوچنے کے عمل پر خواہ وہ غمِ جاناں ہو یا غمِ روزگار اثر انداز ہوتے ہیں۔ حالی کے زمانے میں قوم کا دکھ سب طرح کے دکھوں پر بھاری تھا چنانچہ علامات میں تبدیلی آئی شاعر کی محبوبہ قوم ٹھہری۔

اقبال کا عہد عظیم انقلاب سے دوچار ہوا ـــــ ہندوستان میں بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ اقبال نے "آفتاب تازہ" کی بشارت بھی دی۔ لیکن ان کے عشق کا تصور بھنور میں پھنس گیا ـــــ عشق کے آفتاب سے جنسی کشش کو باسی کھانے کی طرح الٹ دیا۔ 'مرد کامل' ان کا محبوب بنا۔ عشق ارتقائی منازل طے کرنیکا اضطراری جذبہ قرار پایا ـــــ وقت بدلا۔ ساز کی لے بدلی ـــــ حسرت نے زمینی عشق کی جگمگاتی دنیا تخلیق کی "حسن بے پرواہ" کے سامنے

"اظہار تمنا، کرنیکی بات چلی . . . . . معشوق شیوہ ہائے گوناں گوں کا عطر بنا جنسی کشمکش کی خوشبو فضا میں بکھر گئی ۔

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا ۔
بڑھ گئیں ان سے تو مل کے اور بھی بے تابیاں — میں یہ سمجھا تھا کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار — دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

جوش صاحب کی جب حقائق سے آنکھیں دو چار ہوئیں، عقل کو اجتہاد کا کام سپرد ہوا۔ تو اپنے ادب کی زبوں حالی کیخلاف انہوں نے اس طرح ٹھوس سوالات اٹھائے ۔ "ہمارے ادبیات میں ہے کیا ۔ وہی روایتی ، مصنوعی اور بے سمجھے بوجھے حسن و عشق کے چٹخارے ، وہی نارواقناعت اور ترکِ دنیا کے چبائے ہوئے نوالے . . . . کیا ہم ان رانڈوں کی طرح بین کرتی . . . اور بوڑھیوں کی طرح چھاتی پیٹتی ہوئی ، جھوٹے آنسوؤں کی شاعری سے طوفانی سمندروں کے تڑپتے ہوئے سینوں پر جہاز چلا سکتے ہیں ۔ جس شاعری کی ہڈیاں زنداں کی زنجیروں سے کھرچ کھرچ کر نکالی جاتی ہوں جس کی سفید آنکھیں ہمیشہ چھت سے لگی رہتی ہوں . . . . جو حقیقی حسن و عشق کی چاشنی سے بیگانہ ہو ۔ اس شاعری کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہم زندگی کے پُرہول ، ناہموار میدانوں کے طے کرنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں" ؟ اسی فکر کے تحت جوش صاحب نے زمانے کے مروجہ تصورات اور اپنے طبقے کی فکر سے آزاد ہو کر اپنے عاشقانہ تصورات پر سے اس طرح پردہ اٹھایا ۔

"جی ہاں میں نے عیاشی کی ہے جی بھر کر . . . . عشق بازی کی ہے جی سے گذر کر . . . . عیاشی نے میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں ۔ عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں

(یادوں کی برات ۶۶۸ ص ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔)

"میں نے عشق و عیاشی کو ہمیشہ ایک بہت احترام آمیز فاصلے پر رکھا ہے ۔۔ ۔۔۔۔۔ رات ہوتے ہی اس کی شمع جلائی اور صبح ہوتے ہی بجھا دی"

(ص ۶۶۷ ایضاً)

"میں نے بھنورا کی زندگی کو اپنایا ۔۔۔ ہر گل نو دمیدہ پہ منڈلایا ۔۔۔۔ گایا، گونجا ۔۔۔ اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا۔

در ہیچ مقامم نہ گذارد بہ درنگے
از بوئے بہ بوئے بردارد رنگ برنگے

(ص ۶۶۶ ایضاً)

"میری بیشتر عاشقانہ نظموں میں اس چیز کی لوگ کہتے ہیں کمی ہے جسے آہ و فغاں اور سوز و گداز کہا جاتا ہے ۔ اگر ایسا ہے تو اس کی ذمہ داری میرے عشق ہائے کامراں پر ہے ۔۔۔ واضح رہے عاشق کامیاب ٹسوے نہیں بہاتا" ۔۔۔۔۔ میری شاعری میں آنسو، آہیں ۔۔۔ اور سینہ کوبیاں بہت کم ہیں ۔ کیونکہ یہ چیزیں ناکامی اور انفعالیت سے پیدا ہوتی ہیں اور میں ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روح ادب ص ۱۳

نظم میں عشقیہ فلسفہ اس عنوان سے ادا ہوتا ہے ۔

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو
خاک ہونا ہے تو خاک کوئے جاناں کیوں نہ ہو

ان بیانات کی روشنی میں جوش صاحب کا نظریۂ عشق کچھ اس طرح واضح ہوتا ہے ۔ کہ

۱۔ اول تو یہ کہ گو بیوی سے انہیں محبت تھی لیکن ذہنی سطح پر جو محرومی تھی وہ انہیں

غالب کی طرح گھر کی چہار دیواری سے باہر رہے گئے ۔

۲۔ دوم ۔ اس عہد میں " کوٹھے والیوں " کو سیم و زر کے عوض کئی ہونٹوں سے پینا سستی شراب کی مانند لنڈھانا ، دہان و تیل کی طرح بکاؤ مال سمجھ کر قیمت لگانا ، رات کو منڈلانا صبح کو اڑ جانا ، شرفاء و رؤساء کا محبوب ترین شیوہ تھا ۔ حضرت جوش نے اپنے طبقے کی بہت سی فرسودہ روایات کا پردہ چاک کیا ۔ باغی ہوئے لیکن پھر بھی خو بو کہیں نہ کہیں " ہزار پردوں سے جھانکتی ضرور ہے ۔ " ہر گل نادمیدہ پہ منڈلایا . . . . اس کا رنگ چکھا . . . اور پھر اڑ گیا ۔

(ص ۶۶۶ یادوں کی برات)

۳۔ سوئم ۔ یہ کہ حضرت جوش آفریدی پٹھان تھے ۔ وہ اپنی شکست کو کسی بھی قیمت پر ماننے کے لئے تیار نہیں ۔ خواہ اندر سے شکست کھا چکے ہوں ۔ ابتدائی عشق میں ناکامی کے مراحل بھی طے کرنے پڑے ۔

ادھر عروسی لباس زر میں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا
ادھر کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفنی پہنا رہی ہے
ادھر عرق ہے مری جبیں پر ادھر جھلکتی ہے جوش افشاں
ادھر لبوں پہ ہیں سرد آہیں ادھر صبا گنگنا رہی ہے

شادی و مرگ ۔ نقش و نگار ص ۱۵۲

(۴) چوتھے یہ کہ عشق کے متعلق داغ نے بہت پہلے فیصلہ سنایا تھا ۔

" اسکو ہرگز نہ برملا کہیے "

کیونکہ محبت امانت ہے جسے 'برملا' کہنا ایک قسم کی خیانت ہے لیکن جوش صاحب اسے 'ببانگ دہل کہنے' میں مردانگی محسوس کرتے ہیں ۔ شاید اس لئے کہ وہ عشق نہیں کرتے بلکہ عشق بازی کرتے ہیں ۔

(۵) پانچویں یہ کہ ان میں نازبرداری کے متمنی عیش پسند عاشق کی روح تڑپتی ہے جس کا بچپن خوشیوں کے پالنے میں جھولا ، جس نے جوانی زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں گذار دی۔

(۶) چھٹے یہ کہ جوش کا عشق تقلیدی نہیں۔ وہ سنا سنایا اکتسابی اور کتابی نہیں بلکہ ذاتی تجربات کی آنچ میں پک کر کندن بنا ہے۔ جو ہر قانون کو گرفت میں لیتا، ہر پابندی کو توڑتا، ہر چٹان سے موج کی طرح ٹکرایا ہے۔ اس لئے ان کا عشق سماجی مسرت میں اضافہ کرتا ہے۔

(۷) ساتویں۔ حضرت جوش کا عشق کامیاب و کامراں ہے۔ نشاط آور بہار خیز ہے جس میں کلیاں چٹکتی اور پھول کھلتے ہیں۔ محبت میں کامیابی رازہائے سربستہ کو کھولنے، عمل کی پرپیچ راہوں پر چلنے، اور مسلک حیات تک پہنچنے میں مہمیز کا کام کرتی ہے۔ محبوب کے دل میں عاشق کی جگہ ہے۔ یہ صرف "رعنائی خیال" نہیں بخشتا بلکہ زندگی کے لئے آب حیات بن جاتا ہے۔

(۸۔ آٹھویں۔ جوش کے عشق میں چمکتے رنگوں کی جھلملاہٹ اور لاکھوں شمعوں کی جگمگاہٹ ہے۔ محبوب کے التفات تواتر نے ان کے خیال اور عمل دونوں میں نشاط کے جھاڑ و فانوس روشن کر دیئے اور انہیں رجائیت کا تصویری پیکر بنا دیا ہے رجائیت قنوطیت کی ضد ہے۔ ایک اثباتی اور دوسرا منفی، لیکن رجائیت منفی جذبہ اس وقت بن جاتی ہے۔ جب وہ حقائق سے چشم پوشی کرکے راہ فرار اختیار کر لیتی ہے۔ لذت پرستی، لذت کوشی ذہنی عیاشی نہیں بلکہ فہم و ادراک کی مدد سے حقائق زیست کو پالینا ہے۔ اگر رجائیت صرف لذت پرستی اور نشاط آگین طرز حیات کو تصور کر لیا جائے تو اسکے ڈانڈے Hedonism سے جاکر مل جاتے ہیں۔ خیال میں شمعیں روشن ہو جاتی ہیں۔ لیکن سماج سے رشتہ

کٹ جانے کی بنا پر عمل افسردہ ۔ مضمحل اور بیمار ہو جاتا ہے ۔ نشاط اور رجائی اندازِ فکر مسرت میں اضافہ ضرور کرتا ہے لیکن مسرت مجرد شے نہیں ۔ اس کا رشتہ سماج سے جڑا ہوا ہے ۔ سماج کو حسین اور خوبصورت بنائے بغیر حقیقی مسرت ، خوشی اور نشاط ناپید ہے ۔

حیات کے دو بنیادی تقاضے ہیں ۔ ایک بقائے ذات ۔ دوسرا بقائے نسل ۔ اگر کسی معاشرے میں حیات کی تمام ضروریات اور خواہشات پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں تو وہاں امن و آسودگی اور پیار کی کلیاں چٹکتی ہیں ۔ لیکن اگر اکثریت محروم اور اقلیت ہر طرح آسودہ ہوتی ہے تو وہاں معاشی و معاشرتی جبر کے خلاف باغیانہ خیالات کا سیلاب امنڈتا ہے ـــــ اقدارِ حیات شکست و ریخت سے گذرتی ہیں اور پیہم تصادم کی صورت میں معاشرہ نئے اقدار تخلیق کرتا ہے ۔

ہے مبری وحشت عدد اعتبارات ، جہاں
مہر گرد دل ہے چراغ راہگذار ، با دیاں

حضرت جوشؔ جس ماحول میں جوان ہوئے اس میں عورت و مرد دو مختلف دھاروں میں بہہ رہے تھے ۔ مردوں کی دنیا میں ماں اور بہن کے رشتے بھی تھے ۔ لیکن دوسرے تمام رشتوں پر قدغن لگا ہوا تھا ـــــ جوشؔ نے زندگی کی ہر سطح پر اس محرومی کو شدت سے محسوس کیا اور اس کے خلاف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کیا ـــــ جوشؔ کا تصورِ عشق دراصل حیاتیاتی جبر اور فرسودہ معاشرتی اقدار کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے ـــــ جوشؔ کا " مکالمہ مابین شبیر حسن خان اور جوشؔ " ان کے عشقیہ تصورات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے ۔

شبیر حسن خان ـــــ ہائیں کیا دیکھ رہا ہوں ۔ ارے یہ کس گلی میں دکھتے گھٹنوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹہل رہا ہے ۔ باغی بھگوڑے جوشؔ ـــــ فرقِ مبارک پر ماہ د

سال کے یہ انبار اور چشم بد دور یہ طفلانہ رفتار ـــــ اللہ اللہ یہ غروب کا ہنگام اور زمام خدا ۔ یہ کوچۂ طلوع میں خرام ۔ یہ خارستانِ اضمحلال اور یہ گلگشت کوچۂ گل عذار ۔ تجھ کو گیسوؤں کے پیچ و خم سے نکالا اور عقدہ ہائے کائنات کے سلجھانے کی راہ پر ڈالا ۔ تجھ کو افلاک کے حواس چگ لینے والی چکاچوند کے میدان سے بچایا اور ثوابت وسیارے سے آنکھیں کھولدینے والے دائرے میں لیا ۔ تیرے افسوں فروش دل کو بجھایا اور تیرے طاق میں آفتابِ دماغ جگایا ۔ تجھ کو مجنوں کے گلی ڈنڈا کھیلنے کے میدان سے ہٹا کر سقراط کی دانش گاہ میں داخلہ دلایا اور چار دن میں سفیدی کی طرف مڑ جانے والی کالی زلفوں کی خواب آور چھاؤں سے اٹھا کر تجھ کو علم و نظر کے ادبی کاشانے میں بٹھایا لیکن اے رامش و رنگ کے رسیا ۔ کھلنڈرے جوش تو پھر بھی راہ راست پر نہ آنا تھا نہ آیا ۔

(پورا محاکمہ کیا ہے سختی کے ساتھ)

اور ایک الہڑ کی صرف موجِ تبسم کی پکار سن کر اکاڑی پچھاڑی تڑا کر جادہ حکمت سے پل بھر میں بھاگ کھڑا ہوا ۔ بالکل اس لونڈے کی طرح جو استاد کا تھپڑ کھا کر مکتب سے اس طرح فرار ہوتا ہے کہ اس کی ایڑیاں اس کی کمر پر بجنے لگتی ہیں ـــــ حیف صد حیف کہ تیری بانہوں اور گودوں پر جان چھڑکنے والی شاعری نے تجھ کو مجھ سے چھین لیا ـــــ افوہ ! یہ کم بخت شاعری یہ بلائے شاعری ۔ یہ بلبلیں ، اچھلتی ، دندناتی ، کودتی ، ولولاتی ، پھاندتی ، پھلانگتی ، شلنگیں بھرتی ، ہواؤں کی طرح اڑتی ، لٹوؤں کی طرح گھومتی ، اور بگولوں کی مانند ٹکراتی (یہاں شاعری کے تمام رخ کس خوبی سے بیان ہوئے ہیں) شاعری جو ہر صبح کو نئی نئی وادیوں میں جھومتی ، ہر رات کو نئے نئے چاندوں کو چومتی ، ہر آن نئے نئے مکھڑوں کے لو سے لیتی ، نئے نئے ساحلوں پر منڈدے چھواتی ، نئی نئی گلیوں میں دھونی رماتی اور جب چٹاخ پٹاخ کو نچلے بیٹھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے تو آسمان کی طرف اشارہ کر کے گانے لگتی ہے ۔

در ہیچ مقامم نہ گذارد بہ درنگے
از بوئے بہ بوئے برد از رنگ برنگے

افسوس اس متواتر دھمال اور مسلسل دھاچوکڑی سے کبھی نہ تھکنے والی اور ہر ادوہم کے بعد تازہ دم ہونے والی چھوکری کے مزاج کی افتاد ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو اس کی رنگینیوں کی غذا سے محروم کر دیا جائے تو وہ خون تھوک کر مر جائے۔ اور اس مراتی کو اگر ایک آن کے لیے بھی رت جگوں کے ہمہموں، رنگینیوں کے زمزموں، چڑیوں کی چوں چوں، سارنگیوں کی روں روں، شراب کے پیالوں، الہڑوں کے گالوں، پھولوں کی کلیوں، رنگ رلیوں تانوں کے ہلکوروں، طبلے کی ٹکوروں، گوپیوں کی ہولیوں، گوریوں کی ٹولیوں، بازاروں کے بجتے کٹوروں، بالیوں کی انکھڑیوں کے کھنچے ڈوروں اور چوکڑیوں، تجھیاٹوں، قہقہوں، قلقلوں، قلقاریوں، سیجوں اور باہنوں لوسوں برکھا کے گیتوں، رتیوں، ٹانکوں، نوٹنکیوں اور میلوں ٹھیلوں سے دور کر دیا جائے تو یہ چھوکری دریا سے نکلی ہوئی مچھلی کی مانند ساحلِ حیات پر دم توڑ دے گی۔ کاش اے جوش تو لیا ہوتا، مسخرہ ہوتا، مجذوب ہوتا، مراتی ہوتا، سقری ہوتا، مداری ہوتا، مالیشیا ہوتا، مالی ہوتا، موچی ہوتا، مہتر ہوتا، مولوی اور مفتی ہوتا جو کچھ بھی ہوتا لیکن شاعر نہ ہوتا۔

جوش ــــــ اللہ اللہ ــــ آپ کے سے حلیم کی زبانی اور ایسے ہیجانی الفاظ کا طوفان ــــــ آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ جو بھی منہ میں آئے کہہ لیجیے۔ پھر بھی خطا معاف۔ اتنی دقیقہ سنجی کے باوجود آپ اس بات کو پا نہیں سکے کہ اس سراپا ناز کی نیاز مندانہ موجِ تبسم کی پکار پر ایک میرے سے شاعرانہ مزاج رکھنے والے کا تابِ حکمت سے فرار مطلق ارادی نہیں قطعاً اضطرابی عمل تھا۔ اور کسی اضطرابی عمل پر احتساب و سزا جائز نہیں۔ بندہ پرور مجھ سے کہیں زیادہ اس حقیقتِ کبریٰ سے واقف ہیں کہ پورا نظام ارض و سماوات، اور یہ تمام ناقابلِ شمار اشیاء کائنات بے نہایت سختی اور استثنیٰ دشمنی بے مروتی کے ساتھ بکھرے اور جکڑے ہوئے ہیں ــــــ علت و معلول کی ناشکستنی زنجیر میں اور کسی فرد کو خواہ وہ کتنا ہی بے پناہ شخصیت

کا مالک کیوں نہ ہو یا سب سے بڑا اطرم بازخاں ہی کیوں نہ ہو یہ مجال نہیں کہ علت و معلول کی اس زنجیر کو توڑ دیا اس کے توڑ دینے کا تصور بھی کر سکے۔ اس بے رو رعائیت حلقۂ جبریت میں اس طفلانہ مفروضے کی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی کہ انسان چونکہ مادرِ قدرت کا سب سے چھوٹا اور اس بنا پر سب سے لاڈلا بچہ ہے اس لئے قدرت نے مادرانہ شفقت کے جوش میں آکر اپنے اس دلارے کو نظام شمسی کے حلقۂ جبر سے نکال کر میدانِ قدرت میں گلگشت فرمانے کی اجازت دیدی۔ اور اس سوتیلی دنیا میں اے مرے سگے بیٹے جو جی چاہے سو کر لے۔ آپ خود اس بات کو جانتے اور مانتے ہیں کہ ہر فرد کے دماغ کی انفرادی ساخت اس کے خانوں کی تنگی و فراخی اس میں بھرے ہوئے مصالحوں کی کمیت و کیفیت عناصر ترکیبی کی مقدار و عددیت جذبۂ عقل اور تحمل کا عدم توازن فرد کا ذاتی میلان، قوام کی پختگی، خامی، مرغوبات، مکروہات کی کشمکش اور نسلی ماحولی غذائی موسمی تاثرات کے پیدا کردہ مزاج کی نوعیت ہی انسان پر حکومت کرتی ہے۔ جدھر چاہتی ہے اس کو لے جاتی ہے ——— بعض اپنی سرکارِ ذات کے خوشامد خورے یہ دعوی کرتے چلے جاتے ہیں کہ ہم جو چاہیں سو کر سکتے ہیں۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ چاہنا ہی سرے سے ہمارے اختیار میں نہیں . . . .

ارے غضب خدا کا ترس کھانے کے بدلے آپ اس نامراد کو ڈانٹ پھٹکار رہے ہیں۔ جس بدبخت کے سر پر قد آدم بجلی گر چکی ہو۔ جس کی عقل کے بخیئے ادھیڑ ڈالے گئے ہوں۔ جس کے حواس کو جھلس کر رکھ دیا گیا ہو۔ جس کی عقل اس کی چھری سے ذبح کر ڈالی گئی ہو۔ جو تمام یونان کے ساحلوں کی فہرست سے خارج کر کے، نجد کے بیداریوں کے رجسٹر میں درج کر دیا گیا ہے اور جس کو اس دوشیزہ کی نگین، غم انگیز شاعری نے جس کی ذات خود موضوع شعر ہے مرکزِ حواس سے کچھ اس طرح گرا دیا ہے کہ ادر تو اور اب وہ خود اپنے سے بھی آنکھیں ملا نہیں سکتا۔ گورلیوں کے گزند رسیدہ مظلوم پر سب و شتم فرمانا آپ جیسے دانا کے شایانِ شان نہیں۔

شبیر حسن خان ——— ارے اس قدر مظلوم نہ دکھا اپنے آپ کو۔ یہ عذاب جو تجھ پر نازل ہے تو نے خود اپنے ہاتھوں اپنے سر پر لادا ہے۔ اس آگ کو جو تیرا احاطہ کئے

ہوئے ہے تو نے ہزاروں جتن کر کے خود اس آگ کو سلگایا ہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ اے جوش جب کبھی بہ تقاضائے بشریت مجھ پر غفلت طاری ہوگی یا خواب گراں کی کیفیت طاری ہوئی ہے۔ تو نے معاشقے سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا ہے ـــــ اور اس نادان کے دل کو موہ لینے کی نیت سے اس کو جھوم جھوم کر اپنا کلام سنایا ـــــ تو نے اس کی نوبصارت کنواری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سوزندہ نگاہ سے دیکھا ہے جو سنگ و آہن تک سے لو نکال سکتی ہے۔ تو نے اپنے دھڑکتے دل کے جذبات اس کی رگ رگ میں دوڑائے ہیں۔ . . . .

تو نے اس کو موسم بہار سے پہلے ہی چٹکا دیا ہے . . . . . تو نے اپنی دانائی اور اس کی نادانی دونوں پر ظلم ڈھایا ہے۔ اور اس دہرے ظلم کے باوجود اپنے آپ کو مظلوم کہہ رہا ہے۔

" اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست "

جوش ـــــ ارے سر پیٹ کر مر جانے کو جی چاہتا ہے ـــــ آپ کا یہ غیر حکیمانہ ارشاد کہ میں دیدہ دانستہ اس بلائے بے پناہ میں گرفتار ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اپنی سرشت و طینت پر حاوی ہو کر اپنے ارادے سے اقدامات کئے ہیں۔ حالانکہ انسانی افکار و کردار و گفتار تمام کے تمام طینت و سرشت کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں اور ہماری تمام ترنگوں اور ولولوں کا سرچشمہ ہمارے وجود کی میزان کل اور ہماری طینت کے مجموعی فرمان سے ہمارے دلوں سے خودبخود پھوٹتا ہے (جبلی تقاضا) اور جس وقت کسی ولولے کا چشمہ پھوٹتا ہے بارگاہ عقل میں گھنٹی بجنے لگتی ہے ـــــ اس وقت اپنے حجرے سے نکل کر ہماری خواہش کے خط و خال کو پرکھتی ہے ـــــ اگر عقل کے نزدیک وہ خواہش جائز ہوتی ہے تو وہ اس کو پروانہ راہداری دے دیتی ہے ـــــ اور اگر اس کے نزدیک وہ خواہش ناجائز ہوتی ہے تو وہ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے ـــــ جس آدمی کے جسم میں اگر عقل قوی تر ہوتی ہے تو وہ خواہش کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کو بے بس کر دیتی ہے اور اگر خواہش عقل سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوتی ہے تو وہ عقل کو دھکا دیکر

اس کو اس کو حجرے میں بند کر دیتی ہے۔ اور ارادے کو جو چپراسی کی وردی پہنے برآمدے کے اسٹول پر بیٹھا ہوتا ہے آواز دیکر بلاتی ہے اور اس کے کاندھے پر بیٹھ کر عمل کے دائرے میں آجاتی ہے ــــــ خانصاحب! کسی بڑے سے بڑے دیوتا کی بھی یہ مجال نہیں کہ حسن اپنے خلوتِ ناز کو اتار کر اور لباسِ نیاز پہن کر اس کے سامنے آئے اور سرمگیں آنکھوں سے آنسو بہائے اور وہ پگھل کر نہ رہ جائے۔ خانصاحب! ــــ انصاف سے کام لیجیے اور خدا لگتی کہیے۔ جب وہ دوشیزہ اترے مکھڑے اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے سوگوارانہ درآئی تو کیا میں اس فتنۂ آخر الزماں، کی طرف سے منہ پھیر کر جھپٹ پڑتا وضو کے بدھنے کیطرف۔ کیا میں بیٹھ جاتا مصلے پر نمازیں پڑھنے۔ پہن لیتا جامۂ احرام اور کرنے لگتا کعبہ کا طواف اور دبک کر بیٹھ جاتا کسی مفتی کے دائرے کی مقدس چھاؤں میں . . . .

شبیر حسن خان ــــــ تو میرے بخشے ہوئے اسلحے سے مجھ پر حملہ کر رہا ہے . . . . . . میں ان ہتھیاروں سے زخمی ہونے والا نہیں۔

جوش ــــــ خانصاحب بہادر ــــ غصہ آ چکا ہے آپ کو۔ اور اس بنا پر آپ منطق سے منہ پھیر چکے ہیں۔

شبیر حسن خاں ــــــ بس بس۔ چبا چبا کر زیادہ باتیں نہ بنا۔ کیا تو نہیں آئے گا میرے سامنے۔ نہیں ترک کرے گا زلفوں کی چھاؤں کو اور نہیں باز آئے گا تو جنوں سے . . . . تازیانے، درے . . . .

جوش۔ خانصاحب آپ نے اسے دیکھا ہی نہیں۔

منع کمنی ز عشق بیر ائے مفتیٔ زماں

معذور دارمت کہ تو او را ندیدۂ

آپ جس چیز کو میرا جنون فرما رہے ہیں وہ اس کے لبِ قدرِ جمال نہیں ہے۔

با حسن اش این جنوں کہ تو بینی تحمل است
ناصح ملامتے مکن این ناشکیب را

شبیر حسن خاں! اچھا سمجھ گیا۔ اس لونڈیا کا زہر تجھ پر پوری طرح چڑھ چکا ہے...
تو پھر اے خیرہ سر جوش تو دیکھ مرے ہاتھ کے گرز گراں کو ... ہوشیار ... خبردار۔
جوش ۔ سمجھ گیا۔ سٹھونی کی رگ پھڑک چکی ہے۔ منہ سے کف نکل رہا ہے۔ اس
پیشانی پر شکنیں پڑ چکی ہیں۔ جس سے حکمت کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں۔ سچ کہا ہے کسی
دانائے روزگار نے کہ

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ با آدمی بزرگ شود

اور اس کے فوراً بعد اس طرف سے گرز چلنے، تازیانے اور دروں کی آواز آتی
ہے اور اس طرف سر سے خون بہنے لگتا ہے۔ خدا کا شکر محبت کا لیوں خاتمہ بخیر ہوا...
...."

حضرت جوش کے عشق میں سرشاری، جنوں خیزی، زلفوں کی مہکار، اور سینوں
کا ابھار ہے۔ ان کا ہر سراپا گاگریں چھلکاتا، غمزوں کی کلیاں چٹکاتا، اداؤں کی
گھٹائیں برساتا ہے۔ "گنگا کے گھاٹ پر"، "جوانی کا تقاضہ"، "کوہستان دکن
کی عورت"، "مالن" "جامن والیاں"، تصویری پیکروں کے نگار خانے اور جنسی
کشش کی بے باک ترجمان ہیں۔

رنگین کلائیوں کے جوڑے — چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے — قرآں ہے کہ رحل پہ دھرا ہے

"جمنا کے کنارے"

رخ پہ سرخی آنکھ میں جادو — بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون سمٹے ابرو — نیچی نظریں بکھرے گیسو

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

"یہ کون اٹھا ہے شرماتا"

سرا دلائی کا سر پہ نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل بدن چرائے ہوئے

لبوں پہ مہر خموشی، خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ، جبیں پہ دمک نظر میں شراب

سوائے صبح سے روشن چراغ سیم تنی
شگفتہ غسل سحر سے مزاج گلبدنی

"گنگا کے گھاٹ پر"

ذاہد فریب، گل رخ کافر دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، نوخیز، حشر ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا فسوں گر

کافر ادا شگفتہ، گل پیرہن، سمن بو
سرو چمن، سہی قد، رنگیں جمال خوش رو

"جنگل کی شاہزادی"

چال جیسے تند چیتے، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز بپھر بلا شباب

"کوہستان دکن کی عورت"

عشوے ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے
چھل بل ہے کہ چھاتی کو زمیں لوٹ رہی ہے

انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے
مکھڑا ہے کہ بربت پہ کرن پھوٹ رہی ہے

قامت ہے کہ رعنائی سرو چمنی ہے
کیا گلبدنی گلبدنی گلبدنی ہے

گردن میں چندن ہار ہے ہاتھوں میں ہے کنگن
امڈے ہوئے عشوے ہیں کہ گرقبا سوا جوبن

جولاں ہے جوانی کے دھندلکے میں لڑکپن
کوندا ہے جو پنڈا تو جنوں خیز ہے اپٹن

گل رنگ شلوکا ہے قبا ناردنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی گل بدنی ہے

"کیا گلبدنی ہے"

جوش کی ان نظموں میں جوانی کی تاسیں اور ان کا آہنگ بلند ترین سطح پر نظر آتا ہے۔ نسوانی حسن کوندے کی لپک اور بجلی کی چمک بن کر ذہن کے گرد ایک لمحاتی ہالہ بناتا ہے لیکن دیرپا نہیں ہے۔ جنسی کشش سے جسمانی و جمالیاتی سطح پر اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ صرف جسم کے ذریعے شخصیت کے انگ انگ تک رسائی نہیں ہوتی ذہنی لگاوٹ ضروری ہے۔

محاکات کی رعنائیوں سے جوش کی عشقیہ شاعری بھری پڑی ہے۔

"گلے پہ ہمدم طفلی کے تیغ خوں پھیری
ذرا سا مسکرا سر رخ ہونٹوں پہ زباں پھیری

یا جب ذرا سادہ مسکراتی ہے — اور ایک آنکھ کو دباتی ہے
تخت ہلتا ہے روح کا کیچ سے — دل پہ لگتی ہے اک انی بیچ سے
سہے پلو کی الاماں ڈھلوان — جیسے ہو قتل عام کا اعلان
ہونٹ یوں گفتگو میں ہلتے ہیں — جیسے بیلے کے پھول کھلتے ہیں
جب کسی لفظ پر وہ دیتی ہے زور — لب پہ طبلے کی گونجتی ہے ٹکور

یا۔ ہائے پلکوں کی بار بار جھپک — جیسے رادھا کے گھنگھروؤں کی کھنک
ناز سے کور یوں کترتی ہے — جوں گلے میں شراب اترتی ہے
تن میں یوں ڈھلتے ہیں من کے راگ — ناچتی ہے الاؤ میں جوں آگ

یا۔ سونگھتی ہے کچھ اس مزے سے پھول — وحی کا آسماں سے جیسے نزول
آہنی جسم میں بسے ہوئے انفاس — جیسے گلشن میں ابر گل کی مٹھاس

یا۔ فقروں کی یہ تازگی یہ لہجے کی بہار — قرباں ترے اے نگار شیریں گفتار
اللہ ری کھنکتی ہوئی آواز تری — جیسے یہ ہو جیسے اشرفی کی جھنکار

حسن کی جتنی مکمل تصویریں حضرت جوش نے کھینچی ہیں اور اس کی رعنائیوں کو جس

طرح انہوں نے اجاگر کیا ہے۔ اردو تو کیا فارسی شاعری میں بھی خال خال نظر آتی ہیں۔
"مہک رہی ہے ہوا کم سنی کی خوشبو سے" برہنہ پا ہے تو ہر نقش پا گلابی ہے"
اس میں قوس و قزح کے مدہم رنگ، سمندر کا زیر و بم، پھولوں کے آتشیں
رخسار کی دمک اور پنکھڑیوں میں سجی ہوئی جوانی کی عجیب و غریب تصویر سامنے آتی ہے۔
جوش اپنی مشہور نظم "رندانہ عبادت" میں حسن کے حضور یوں گہربار ہوتے ہیں۔

اے شیخ کہاں تک یہ تشنیع و دل آزاری
میری تو عبادت ہے لب نوشی و مے خواری

فیضان مشیت سے حاصل ہے مجھے اب تک
بانہوں کی گہرریزی بوسوں کی شکرباری

بکھری ہوئی زلفوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں
سبزے پہ ہم آغوشی، ساحل پہ گہرباری

اسرار انا الحق تک پہنچی ہے نظر اب تو
اس دولت پہلو کی اللہ رے دلداری

وہ وصل میسر ہے جو فصل سے خالی ہے
معراج ہے اور کرب قوسین نہیں طاری

وہ بنت سمن میرے پہلو میں نہ آسکتی
خورشید علیخاں کی ہوتی نہ جو غم خواری

(خورشید علیخاں میرے محبوب و منفرد دوست۔ جو نارتھ ناظم آباد کراچی میں رہتے ہیں اور جن
کو "فتنۂ آخرالزماں" نے دلبر جانی، کا خطاب عطا فرمایا ہے)
حسن کی جاندار تصویر کشی ملاحظہ ہو۔

کوئی شبنم بدن آہستگی سے
گلوں کی دھاریوں پر ہے خراماں

میری تخئیل میں غلطاں ہیں اے جوش
شکن ہائے قبائے نوعروساں

دوسری نظم میں یوں گہرباری ہوتی ہے۔

یہ ازل سے ہے عشق کا دستور
فرش سے بام عرش تک جائے

سات پردوں میں یہ کلی چٹکے
اور سارا نگر مہک جائے

نظروں نظروں میں خواہ باتیں ہوں
پھر بھی آواز دور تک جائے

اور خصوصاً کسی حسینہ کی آنکھ
جب کبھی خیر سے اٹک جائے

پھر تو اس ناروا جسارت کی
پل میں ہر کان تک بھنک جائے

آن میں فرقِ صالحینِ کرام
سن کے یہ ماجرا چٹک جائے

فرطِ شرمندگی سے کہنے کا
سر جھکے اور منہ لٹک جائے

ہر زمیں ہر مکان سے اٹھ اٹھ کر
شورِ تشنیع دور تک جائے

حسن پنجوں کے بل چلے پھر بھی
سنکڑوں کوہ تک دھمک جائے

آتشِ قہرِ کشتگانِ رسوم
یہ دھمک سنتے ہی بھڑک جائے

مفتیانِ زلوں کے صبر کا جام
شدتِ جہل سے چھلک جائے

آسیوں کی کمانِ تنگ انداز
فرقِ معصومہ پر کڑک جائے

بلبلاتی خزاں کے طعنوں سے
دلِ نازِ بہار پک جائے

ہاں اسی خوف سے وہ کوشاں ہے
کہ نہ آنسو کوئی ٹپک جائے

ڈر رہی ہے کہ وقتِ آرائش
نہ کلائی کہیں مڑک جائے

میں جب آؤں تو جھوٹ سے مکھڑے پر
نہ کہیں چاندنی چٹک جائے

کہیں ایسا نہ ہو دمِ گفتار
کہ گلے میں صدا اٹک جائے

کہیں ایسا نہ ہو کہ سسکی سے
شیشۂ رازِ دل درک جائے

کیا چھپیں الجھنیں کہ جب سر سے
بار بار اوڑھنی ڈھلک جائے

اٹھیں ملنے کے واسطے آنکھیں
اور فضا میں نظر بھٹک جائے

جب تبسم لبوں پہ کھینچ کے لائے
فرطِ غم آنکھ میں چمک جائے

چپ رہے تو نگاہ چیخ اٹھے
اور چلے تو قدم بہک جائے

لٹ اٹھائے تو ہاتھ کانپ اٹھیں
لب ہلائے تو دل دھڑک جائے

ضبط کرے جو ایک ہچکی بھی
سو جگہ سے قبا مسک جائے

عشق کی یہ تصویریں محض اعصاب کا تناؤ، جذبے کی پکار، اور روایت کی پرستش نہیں بلکہ شاعر انہیں زندگی کے حقائق تسلیم کر کے پیش کرتا ہے جس سے جاندار شاعری وجود میں آتی ہے جو اپنے خلوص اور صداقت اظہار کی وجہ سے خود ایک قابلِ قدر روایت بن جاتی ہے۔

عشق کے ابتدائی مراحل میں جنسی جذبہ رہنما ہوتا ہے۔ اور فکر اوٹ میں چلی جاتی ہے۔ لیکن زندگی کی کشمکش شعور کے دائرہ کو وسیع کرتی ہے اور اسے پختگی بخشتی ہے جس میں حسن و عشق کی حقیقت کے شعور کا دائرہ بھی شامل ہے۔ جوش کی شاعری میں تجربوں کا تسلسل ہے اور اسی تسلسل نے صداقت پیدا کی ہے اور ان کے اظہار میں ایسی تہذیب و تربیت کو ملحوظ رکھا ہے جو انکی شعلگی فکر، پختگی نظر اور شائستگی مزاج پر دلالت کرتی ہے ــ "دو شعلوں کے درمیان"، عشق کی رنگینی یوں جھلک اٹھتی ہے۔

پھر وہی شغلِ آہ و زاری ہے
پھر وہی زندگی ہماری ہے

گنبدِ شب میں بصد ہیجان
گونج اٹھا ہے شباب کا طوفان

دن کو چھائے ہوئے ہے آدھی رات
شور افگن ہے جیٹھ میں برسات

کال سے تپ رہا تھا جو صحرا
آ گئی ہے ارے وہاں بھیا

سوگ میں ہو چکی ہیں اب ٹھنڈی
چوڑیاں نو عروسِ حکمت کی

دوش پر تجربوں کا لاشہ ہے
جوش صاحب یہ کیا تماشہ ہے

ہونٹ خشک ہیں اور آنکھیں نم
خیریت تو ہے قبلۂ عالم

مجھ پر آنسو بہاؤ اے یارو
سنگ دل ہو تو کنکریں مارو

ہاں یہ موقع ہے صوفیانِ کرام
شہر بھر میں کرو مجھے بدنام

جلد لوٹو ثوابِ غیبت کا
ہاں یہی وقت ہے عبادت کا

کج نہادو اٹھو پئے تشہیر
اس خطا پر چلاؤ طنز کے تیر

کیا یہ حکمت الٰہ و فکر پناہ
پختہ سر، پختہ مغز، پختہ نگاہ

توڑ بیٹھا ہے رشتۂ دارین
دو نگاران شوخ کے مابین

کیونکہ اے کم نظر جہول و ظلوم
تم کو یہ بات ہو سکے معلوم

کہ بہ سرکار دخترانِ قمر
کیا گذرتی ہے قلب شاعر پر

اے حریفانِ علم و جہل پناہ
تم ہو اس سانحے سے کب آگاہ

کہ کوئی گل رخ و سراپا ناز
دوش پر ڈال کر ردائے نیاز

اشک آنکھوں سے جب بہاتی ہے
لو ستاروں کی تھرتھراتی ہے

ناشناسندگانِ علم و نظر
تم کو اس بات کی نہیں ہے خبر

پنکھڑی جب پہاڑ اٹھاتی ہے
نبضِ آفاق ڈوب جاتی ہے

کیا کہوں دل میرا ہے کیوں بے چین
دو نگارانِ شوخ کے مابین

نازِ عذرا ہیں فخرِ سلمیٰ ہیں
ہائے میں کیا کہوں کہ وہ کیا ہیں

کوب دونوں کٹاریاں دونوں
خیر سے ہیں کنواریاں دونوں

لچلچاتے بدن بہکتی چال
سینے اونچے کمر سے نیچے بال

پلو آڑے ہیں اور ٹیڑھی مانگ
الہڑیں اسپرائیں اوٹ پٹانگ

کپکپاتی کمان پنڈوں میں
رسمساتی اٹھان پنڈوں میں

جب بدن میں ہوا سنکتی ہے
خون میں کم سنی جھنکتی ہے

سانس لیتی ہے جب بہ ضرطِ نمو
دوڑ جاتی ہے دور تک خوشبو

ناز مکھڑوں میں جب مچلتا ہے
خال و خد سے عبیر ابلتا ہے

چولیوں میں غضب کی وہ ہمکان
جوں حبابوں کی آبجوئیں اٹھان

ہائے کولہوں کا ہر قدم پہ گھماؤ
ڈگمگائے بھنور میں جیسے ناؤ

آمدِ آتشِ جوانی ہے
آگ پر کم سنی کا پانی ہے

جلدی جلدی جو بات کرتی ہے
لعل لب سے ہوا کترتی ہے

جھولتی ہیں جو صحنِ گلشن میں
کوک اٹھتی ہیں کوئلیں تن میں

زیرِ دل آنچ سنسناتی ہے
غم گالوں میں جھنجھناتی ہے

مسکراتی ہیں جب بہ ناز و ادا
چیخ اٹھتا ہے رنگ مکھڑوں کا

ہائے کیسی پڑی ہے یہ افتاد
صید ہے ایک اور دو صیاد

پہلی آئی بناز و سرمستی
دوسری پل پڑی زبردستی

میں نے اس سے کہا کہ اے الہڑ
مجھکو زلفوں کے دام میں نہ جکڑ

ایک گل رخ کے نام اے ناداں
کر چکا ہوں میں رہن دل کا مکاں

میرے دل پہ چلا نہ تیرِ نگاہ
حملہ آور نہ مجھ پہ ہو للہ

سن کے یہ التجا بصد افسوں
اس نے منہ پھیر کر کہا اونہوں

الاماں سو کٹاؤ اونہوں میں
ہاتھ کا یہ گھماؤ اونہوں میں

دل میرا ہوگیا تہ و بالا
اف کلائی کے لوچ کا بھالا

پھر بپا ہوگیا وہی غوغا
آج سے تیس سال پہلے کا

ہائے دل کا نہ کیوں ہو کام تمام
اک سمن چہرہ ہے تو اک گلفام

ایک میں صلح ایک میں چھلبل
ایک گمبھیر دوسری چنچل

ایک میں شاعری کا سوز و گداز
ایک میں راگنی کا عشوہ و ناز

اس کے مکھڑے پہ ہے جمالِ شعور
اس کے چہرے پہ شوخیوں کا وفور

ایک شیدا ہے شعر و حکمت پر
ایک جولاں رہی شرارت پر

اسطرف دانت میں دبی ہوئی کور
انگلیوں کی ادھر چٹختی پور

صبح صادق کا ایک میں ہے رنگ
صبح کاذب کی دوسری میں امنگ

رہن فتراک ابھی ہیں اس کے بان
اور یہ کڑکا رہی ہے سر پہ کمان

اسطرف ٹنک رہے ہیں بندِ قباء
اسطرف کھل رہے ہیں نام خدا

ایک طرف شرم کی لچکتی شاخ
ایک طرف چھن چھنن چٹاخ پٹاخ

اُس کو دیکھو تو یہ بگڑتی ہے
اس کو دیکھو تو وہ جھگڑتی ہے

ایک کہتی ہے جی جلاتے ہو — اس کو سینے سے کیوں لگاتے ہو
ایک کہتی ہے ظلم کرتے ہو — کیوں جی اب دوسری پہ مرتے ہو
ایک کہتی ہے رندِ مست ہو تم — ایک کہتی ہے بت پرست ہو تم

رسمِ راہِ وفا کے تارک ہو — تم موحد نہیں ہو مشرک ہو
خود تو دونوں کے درمیاں اصلا — کھل کے ہوتا نہیں کبھی جھگڑا
دونوں الزام مجھ پہ دھرتی ہیں — آنکھوں آنکھوں میں طنز کرتی ہیں
تولتی ہیں نظر سے باہنوں کو — تاڑتی ہیں مری نگاہوں کو
اس کشاکش میں ایک کو بھی آہ — دیکھ سکتا نہیں چھپو کے نگاہ
میں ادھر جاؤں یا اُدھر جاؤں — یا دورا ہے پہ گھٹ کے مر جاؤں
جانِ مضطر ہے دل مشوش ہے — کرد گارا بڑی کشاکش ہے
ہر نفس قہرِ آسمانی ہے — کچھ بھی ہو دل میں اب یہ ٹھانی ہے
اپنی پہلی کا در نہ چھوڑوں گا — دوسری کا بھی دل نہ توڑوں گا
اس کو رکھوں گا قلبِ سوزاں میں — اور اسے حجلۂ رگِ جاں میں
دوسری پر جہان واروں گا — اور پہلی پہ جان واروں گا

یا

آنکھیں ہتلیوں سے مل، نیند ہے چشمِ ناز میں
بھر دے حنا کا رنگ بھی نرگسِ نیم باز میں
چھیڑ دل کبھی جو رات کو تاروں سے خوں ٹپک پڑے
درد بھرا ہوا ہے وہ دل کے شکستہ ساز میں
میرے گدازِ عشق کا تم پہ اثر ہوا ضرور
ناز کا رنگ آ چلا میرے دلِ نیاز میں

دیکھنا ٹوٹنے پہ ہے جوشؔ کا دل بھی عنقریب
ذکر تھا کل یہ حسن کے خلوتیانِ راز میں

جوشؔ صاحب جسم کی بھرپور راحتوں، حسیات کی آسودہ لذتوں، حسن کے رنگ ہائے دلآویز کو خالص غنائی انداز میں جب رقم کرتے ہیں تو حسن و محبت کا سجا سجایا سنگھار خانہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس ساری واردات میں وہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی ہمہ گیر ہیں۔ جس میں ہر نوجوان کے سینے کی تڑپ موجود ہے۔ "آگئی جوانی" میں نوجوانوں کی ہر کروٹ سمٹ آئی ہے۔

کسی کی شمع کم عمری کی اکساہٹ کے دن آئے
ترنگیں کوک اٹھیں سینے میں جبناہٹ کے دن آئے
جوانی کی انگیٹھی سنسنائی کوئلے چٹخے!
لہو سے آنچ نکلی تن کی ابلاہٹ کے دن آئے
رپہلی سطح پر مکھڑے کی، دوڑیں چمپئی کرنیں
کٹیلی رس بھری آنکھوں کی کجلاہٹ کے دن آئے
دلائی میں چھپایا گونجتے سینے کے فتنوں کو
جھکالیں شوخیوں نے آنکھ شرماہٹ کے دن آئے
کھلنڈرے پن کے مکھڑے پر رس آیا جوانی کا
لب و رخسار کی خشکی میں چکناہٹ کے دن آئے
مرے ٹھنڈے عرق آلودہ لمحوں کو مبارک ہو
کہ اس کے شربتی پنڈے کی گرماہٹ کے دن آئے
رگ و پے سے دھواں اٹھا، دھوئیں سے لو نکل آئی
نگاہِ ناز سے لوہے کی پگھلاہٹ کے دن آئے

رہا کرتی تھیں محو خواب جو محراب ابرو میں
تو اترے اب ان پلکوں کی جھپکاہٹ کے دن آئے

زہے قسمت کہ اس اندفاعی کدو کاوش سے
ہمارے بے شکن بستر کی گنجلاہٹ کے دن آئے

الٰہی خیر اس طوفاں میں جیب و گریباں کی
کہ اب انگڑائی سے چولی کی مسکاہٹ کے دن آئے

کھنگ پیدا ہوئی موج نفس کی آمد و شد میں
گھر بجنے لگا سینے میں گدگداہٹ کے دن آئے

خدا کا شکر ہے اب اے جوش راتوں کے اندھیروں میں
سرہانے کسی کی پاؤں کے آہٹ کے دن آئے

یا ....

سہانی سزائیں" میں شاعر یوں محبت کے جذبات کو رقم کرتا ہے۔

کیا اِک بت کا پھر مورِ لطف بے کراں تو نے
یہ مجھ پر کیا ستم ڈھایا خدائے اِنس و جاں تو نے
محبت کے شرارے دے کے اک اٹھتی جوانی کو
جلا ڈالا مری فرزانگی کا خانماں تو نے
کسی لو خیز کے اڑتے ہوئے آنچل کی برشش سے
اڑا دیں میری زیبِ تمکنت کی دھجیاں تو نے
انی دیکھی جو میری سینۂ آیات و انسوں پر
تو دل کے پار کر دی ایک مکھڑے کی سنان تو نے
میرے آگے رخ و گیسو کی دیواریں کھڑی کر دیں
میرا دھاوا جو دیکھا سوئے قصر لامکاں تو نے

جو شمع ذات کو میں آندھیوں پہ لے آیا

جو شمع ذات کو میں آندھیوں کی زد پہ لے آیا
مسلط کر دیا آنکھوں پہ زلفوں کا دھنواں تو نے

سبق لیتے مجھے دیکھا جو خارِ دنس کے مکتب میں
مجھے الجھا دیا سرو سمن کے درمیاں تو نے

مجھے گرمِ عمل جب چلچلاتی دھوپ میں پایا
ہنکا دیں میری جانب گھڑگھڑاتی بدلیاں تو نے

جو کانٹے میری منطق کے چبھے قلبِ عقائد میں
تو دے دیں پھول سی باہوں کی مجھ کو بدھیاں تو نے

نمد پوشی پہ قانع ہو گئی جب پختگی میری
تو میرے دوش کو دے دیں قبائے پرنیاں تو نے

میرے سینوں کے شعلوں کو جو کجلاتے ہوئے دیکھا
اک الہڑ کے دل میں بھر دیا سوزِ نہاں تو نے

میرے انفاس سے اب اٹھتی نہیں اب نکہتِ گل بھی
کیا ایسا نڈھال اے دشمنِ تاب و تواں تو نے

مجھے آغوشِ تندِ تنگ برنائی میں بھجوا کر
میری فرزانگی کی توڑ ڈالیں پسلیاں تو نے

میں جو گرجا سرابِ دیں کے متوالوں کی عقلوں پر
تو مجھ کو بخش دی موسیقیِ آبِ رواں تو نے

جب آدھی رات میں طے کر چکا اقلیم حکمت کی
تو پہنا دیں مجھے زلفِ رساں کی بیڑیاں تو نے
مقفل کر چکا میں در جب ایوانِ سماعت کا
تو نازل مجھ پہ کر دی اک انیلی نغمہ خواں تو نے
میرا پتھراؤ جب دیکھا فرازِ عرش و کرسی پر
تو دل میں کھول دیں میرے نگینوں کی دکان تو نے
جو میں نے صلح کر لی کوزہ قامت ذوق پیری سے
تو کڑکا دیں میرے سر پہ جوانی کی کماں تو نے
میرے طبل بغاوت کی گرج پہنچی جو تا گردوں
تو رشوت میں عطا کر دیں کھنکتی چوڑیاں تو نے
جو آنچ آتے ہوئے دیکھی حرم کے آشیانے پر
تو بھر دیں جوش کے دل میں کروڑوں بجلیاں تو نے

اس میں شک نہیں کہ جوش صاحب کے یہاں حسن و عشق کا تصور محض جذبے کے راستے سے بھی آیا ہے ۔ لیکن ایسا نہیں کہ جذبے کے غلبے نے تفکر و تخیل کی راہیں بند کر دی ہوں ۔ ماورائی تصورات اور افلاطونی جذبات سے پاک ان کی محبت مٹی سے رشتہ جوڑے ہے ۔ یہاں ان کی آہنی فکر محبت کے جذبے کو ہر پہلو سے اس طرح گھیرے میں لئے ہے جیسے سمندر کا پانی جزیرے کو گھیرے میں لے لیتا ہے ۔ وہ محبت و عشق کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی کشمکش کو معاشی و معاشرتی تناظر میں دیکھتے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ سائنسی عقل کی بنیاد پر حالات و واقعات کو ان کے اجتماعی روابط میں پرکھنا جانتے ہیں اور یوں محبت کی دنیا میں وہ مادی تصورات کے بل پر انقلاب برپا کرتے ہیں ۔

جوش صاحب کی یہ نظم "ایک جانِ بہار کی سرکار میں" صرف داخلی کیفیات کا اظہار نہیں۔ بلکہ اپنے اندر ایک خارجی وصف بھی رکھتی ہے۔ یہ جذبات انفرادی ہوتے ہوئے آفاقی اور سماجی ہیں۔ طرزِ اظہار، حسنِ بیان اور انتخاب الفاظ میں یہ نظم اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کہی جائے تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔

اے بہ رُخ مصحفِ گلزار و چراغِ حرم و غنچگیٔ و آیۂ گُل باری و قرآن بہار
اے بہ قد موجِ رواں، برق تپاں، سروِ سہی، شاخِ گُلِ تازہ و الہامِ فرامانِ بہار
پئے گل گشت ذرا اس قدِ بالائے فلک تاب و چمن ساز کو دے ا دن خرام
کہ ترے ہجر میں بے کیف ہے بے روح ہے بے تاب ہے بے خواب ہے لیلائے خیابانِ بہار
بزم کی بزم ہے پژمردہ و افسردہ و دل بستہ و خاموش و ملول و غم ناک
کھول دے کاکلِ ژولیدہ و شب رنگ و جہاں صید و گہر بیز کہ ہے چشمۂ حیوانِ بہار
آ بھی جنبش میں کہ ہیں گوش بر آواز ادیبان و حریفان و گل و لالہ و سرو
اے لبِ لعلِ فسوں بار و دل آویز و شکر ریز کہ ہے تجھ پہ فدا لرزشِ دامانِ بہار
بربط و عود و شراب و دف و افسانہ و افسون و شبِ ماہ و رباب و ساغر
آکہ مشتاق ہیں اے جانِ چمن زہرہ جبیں ہوش ربا ماہ لقا شمعِ شبستانِ بہار
دہر ہے خفتہ و آشفتہ و آزردہ و غم دیدہ و ناشاد و زبوں حال و تباہ
ہاں اُٹھا نرگسِ مخمور و گہر تاب و جنوں خیز کہ ہے مجلسِ میخانہ و زندانِ بہار
آج ہے حافظِ شیرازیؒ و خیام و نظیری و فغانی و ظہوری کا جواب
یہ ترا جوش کہ ہے مست و خراباتیؑ و سر حلقۂ رندانِ جہاں قبلۂ خاصانِ بہار

جوش صاحب کی عشقیہ شاعری کو سامنے رکھ کر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے

انہوں نے عام انسان کی طرح محبت کی اور سچائی کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات کو پیش کیا۔ ان کے عشقیہ اشعار صرف حیات بخش اور روح افزا نہیں بلکہ ایک سادہ و روشن ذہن اور دودھ سے دھلی ہوئی شخصیت کا پتہ دیتے ہیں جو جہل افروز اور محبت بیزار فضا میں حسن و محبت کو اعلیٰ مقام دیتا ہے۔ اور محبوب پر یقین رکھتا ہے۔

حضرت جوش کے عشق میں کیف و نشاط کی فراوانی ہے۔ یہ فراوانی جزو ہے اس مجموعی شخصیت کا جس میں شعور کے مختلف چشمے اور تہذیب کے مختلف دھارے آکر ملتے ہیں اور اسے بحر ذخار بنا دیتے ہیں۔ غالب کی طرح حضرت جوش بھی حسن پر قابض و متصرف رہنا چاہتے ہیں۔ غالب کا محبوب اگر غیر سے پینگیں بڑھاتا تو ان کا عشق تلملا اٹھتا اور ” وہ اس کی تاب نہیں لا سکتے “ طنز کے تیر اس طرح برساتے
” کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی :: بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں “
یہاں غالب کی ازبکی اور افغانی رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے اور جوش کی پٹھونی کی ـــــ ’انا‘ کے بت کو مسمار کر کے محبت کرنا دونوں کے بس میں نہیں تھا

ہم پیشہ و ہم راز سے لڑ بیٹھے ہیں
دل سے درد و دمسانہ سے لڑ بیٹھے ہیں
اللہ و شہنشاہ کا کیا ذکر اے جوش
ہم دلبر طناز سے لڑ بیٹھے ہیں

اس میں شک نہیں کہ حضرت جوش اپنے محبوب کو تلوار دینے، اسے مجاہدوں کی صف میں کھڑا کرنے اور اس کے ہاتھ میں ” پرچم “ تھمانے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے یہاں محبوب کے رفیق و ساتھی ہونے کا تصور نہیں ابھرتا۔ بات یہ ہے کہ عورت ان کے یہاں رموزِ دلبری کے لئے ہے ـــــ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کے عشق کے نگار خانے میں صرف محبوب کے خد و خال نہیں بلکہ دنیا کے نقش و نگار بھی ہیں۔ صرف

محبوب کے خد و خال نہیں بلکہ وفا کے نقش و نگار بھی ہیں۔ صرف عاشقانہ زبان نہیں عاشقانہ جذبہ بھی ہے۔ ایسا جذبہ جو کہ میر کے "بہتر" نشتر تو نہیں بنتا لیکن خون کی تازگی، افکار کی گرمی اور روشنی کا جلال و جمال ضرور لئے ہوئے ضرور ہے۔

حضرت جوش کا عشق ذات پات کی پابندیوں سے بلند ارفع و اعلیٰ سطح پر بہتا ہے۔ ان کا عشق بے باک اور جذبہ کھرا ہے۔ وہ تفنیر دشمن سماج سے بیزار اور اپنے طبقے کی دیرینہ روایات سے باغی ہے۔ وہ آزاد ہے جہاں بھی راستہ پاتا ہے راہ بنا لیتا ہے "جامن والیاں" ہوں یا "جنگل کی شاہزادی" ہر لڑکی محبت کرنے کا حق مانگتی ہے۔ **اخلاق ابدی قدر نہیں**۔ زندگی جامد نہیں بلکہ سیال ہے۔ اس لئے اخلاق کے اصولوں کا بدلنا بھی لازمی ہے۔ ایسی اخلاقی قدر جو محبت کی پاکیزگی چھین لے۔ اسے دلوار میں چنوا دے۔ حضرت جوش کے نزدیک ظلم کے مترادف ہے کیونکہ اخلاقی اقدار افراد اور معاشرے کے حقوق میں ہم آہنگی پیدا کرتے اور سماج میں مسرت کے ضامن ہوتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت جوش حسن کے رسیا ہیں۔ حسن خواہ کسی مقام پر ہو وہ اس کے عاشق ہی نہیں بلکہ عارف بھی ہیں۔

رندان بادہ کش کے ہاتھوں سے جام چھوٹیں
تسبیح شیخ الجھے، توبہ کے عزم ٹوٹیں

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا
اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا
یہ بن یہ گل یہ چشمے مجھ سے قریب ہوتے
شاعر کے زیر فرماں یہ سب رقیب ہوتے

12298

لیکن محنت وحسن کو اس کا حق اور صحیح مقام دلانے اور معاشرے میں اس کی حیثیت کو بلند کرنے کے بجائے اسے اس طرح [illegible] کرنا نہ صرف غیر صحت مند بلکہ غیر انقلابی ہے" (محمد مہدی ۔ تحریک ۔ مسئلہ کو الجھایئے مت) ان کی یہ سوچ کسی حد تک ناپختگی فکر کی نشاندہی کرتی ہے ۔

جیسا کہ کہا گیا اس میں شک نہیں کہ حضرت جوش کے یہاں میر کے "بہتر نشتر" نہیں فانی کے "غم کا الاؤ" نہیں ۔ لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کے عشق میں اداسی اور غم سے ایک خاموش لگاؤ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زمینی عشق کیا تھا اس لئے رنج وراحت کے جذبے کے حقیقی آشنا تھے ۔ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ زندگی کی اساس غم ہے ۔

افسوس یہ سن یہ بدحواسی تیری — دل ہی نہیں روح بھی ہے پیاسی تیری
ہنستی ہے تو منہ اترنے لگتا ہے ترا — کس درجہ مکمل ہے اداسی تیری

الفاظ میں غلطیدہ ہے جادو گویا — آواز بدل رہی ہے پہلو گویا
لہجے کا ترے درد عیاذاً باللہ — لفظوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو گویا

کہنا یہ ترا نیند کیسے آتی ہے — راتوں کو طبیعت اور گھبراتی ہے
اف سیج کے نامراد پھولوں کی مہک — ہر سانس میں اک پھانس سی چبھ جاتی ہے

لیکن غم اور ناامیدی کے سامنے سپر ڈال دینا ۔ یا غم کو سینے سے لگائے رکھنا اور اسی میں گھلتے رہنا ان کی خوش طبعی کے منافی تھا ۔ ناامیدی کے پردوں کو چیر کر ان کی حقیقت نگر آنکھ امید کی جھلک ضرور دیکھ لیتی تھی ۔ امید جو زندگی کی ضامن

ہے۔ حضرت جوش کی عشقیہ شاعری محض جنسی جذبے کی تڑپ، جوانی کی بے قراری، رنگ رلیوں کا جھمیلا اور ذہنی عیاشی نہیں بلکہ حیات کا حسین خزینہ اور قیمتی سرمایہ ہے جو مسرت آمیز بصیرت عطا کرتا ہے۔

جوش کے چمنستان حسن و عشق کی بہار جدا اور رنگ منفرد ہے۔ جس کی آراستگی، شائستگی اور مشاطگی میں صدیوں کے تہذیبی عمل کا تعطر شامل ہے۔ ان کی جان لیوا تصویریں حسن کی اداؤں کی تابندگی "کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی نوں ہی دھری رہی۔" کی منزل پر ہیں

کاندھے پر نرم آنچل انگڑائی لے کے ڈالا
کچھ جسم کو چرایا، کچھ سانس کو سنبھالا

نفسیاتی کیفیات، محاکات منفرد اسلوب بیان اور لطف بیان ہی کی عکاس نہیں بلکہ شاعر کے شعور اور کمال فن کی غماز ہیں۔ یہاں شعر کے ہر پیرے سے طبلے پر ٹکوریں چلتی ہیں۔ گوکل بن میں مرلی کی دھنیں بجتی ہیں۔ سارنگی کے تار کانپ اٹھتے ہیں اور ستار کا جھالا بجنے لگتا ہے۔

حضرت جوش کی زندگی کے سرورق پر نفرت نہیں محبت کا عنوان لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے محبت کبھی بھیرویں جونپوری کے مدہم سروں میں الاپی، کبھی اسے دیپک ملہار میں گایا، کبھی رکھب تک پہنچ کے ہی چھوڑ دیا اور کبھی پنیم تک لگا دیا حضرت جوش کا یہی وہ جرم تھا جس کی سزا انہیں تاحیات بھگتنی پڑی۔ خذف پرست، محبت بیزار اور گوہر شکن محافظان تقدیس عصمت، طنز و تشنیع کے تیروں سے مسلح ہو کر میدان میں اتر آئے اور قلم سے کبڈی کھیلنے والوں نے ان پر فتوے صادر کیے، الزامات تراشے گئے کوڑا کرکٹ پھینکا گیا۔ اس لئے کہ "نقاب میں رہنا ہماری ذہنی عادت ہے"

محبت ایک حسین و پاکیزہ جذبہ ہے۔ جسے انسان نے سینے کے افق پر، کہانی کے ورق پر، تصویر کے رخ میں، کھیتوں کی کروٹوں، دریاؤں کے بہاؤ، کارخانوں کی گڑگڑاہٹ اور ہواؤں کے پردوں پر لکھا ہے۔ یہ جذبہ ایک نئی زندگی کو تخلیق کرتا ہے

محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو قبل تاریخ بھی سچ تھا اور آج بھی معتبر ہے۔ جس کا بیان "عریانی" نہیں عین فطرت ہے ـــــ طبقاتی سماج نے جب اس جذبے کی گرمی کو دبانے کی کوشش کی۔ منافقت کو ہوا دی۔ سچ کی نفی کی "چوں بہ خلوت می روند" کے مقام پہ معاشرے کو کھڑا کر دیا تو سرزدی شعور نے علم بغاوت بلند کیا۔ حضرت جوش کی محبت میں عضنیت و مثالیت نہیں بلکہ خاک کی خوشبو ہے۔ جسم کی گرمی اور روح کی پاکیزگی ہے۔ گھٹن کے بجائے حرارت ہے۔ ابہام کے بجائے تازگی ہے ـــ ان کا عشق نہ صرف محبوب بلکہ اپنی ذات کا بھی عارف ہے جو عشق کے لئے ضروری امر ہے۔

ان کا عشق اگر ایک طرف حافظ کی مستی و سرشاری میں عجم کے تہذیبی خزینوں سے دامن کو مالا مال کرتا ہے تو دوسری طرف متھرا بن اور گوکل کی بنسری سے بندرابن میں ترانے گاتا ہے۔ بھرپور غنائیت سے چور چور اپنا روایتی رشتہ امیر خسرو سے جوڑ لیتا ہے۔ جو لغیا کے حسن کو خاطر میں اس لئے نہیں لاتا کہ ان کے چہرے "درشت" ہوتے ہیں۔ خراسان کا حسن اس لئے نہیں پسند کہ رنگت ہے لیکن خوشبو نہیں ـــــ روم میں انکسار سے عاری ہے تو روس میں تکبر ہے، تاتاری حسین مسکراہٹ سے محروم ہیں۔ سمرقند میں شیرینی نہیں۔ خسرو کو تمام خوبیاں صرف ہندوستان کی خاک ہی میں نظر آئیں اس لئے وہ ہندوستان کی عورت کے عاشق ہیں اور وہ ان کی محبوب ہے۔

تبانِ ہند را نسبت ہمین است ـــ بہر یک موئے شاں صد ملک چین است
بہ گندم گو نست میلِ آدمی زاد ـــ کہ ایں فتنہ ز آدم یافت بنیاد
یکے گندم بہ کام اندر نمک دہ ـــ ز صد قرصِ سپید بے نمک بہ

قران السعدین ص ۱۴۲

جوش صاحب کے یہاں حسی کیفیات کا جو ادراک ہے وہ تجربات کی آنچ میں ہی پختہ ہوتا ہے محسوسات کی تجسیم میں غالباً اردو ہی نہیں دنیا کے ادب

کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے ۔ جنسی ہیجان کی اتنی خوبصورت اور محاکاتی

افسوں کاری شاید و باید

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں — یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں رواں

بیداریوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے — کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کئے ہوئے

آنکھوں سے ایک بھاپ سی اٹھتی ہے گرم و سرد — بنیڈرے کے پھیکے پن میں ہے کیسے مزے کا درد

رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں — رخ سے لٹوں کے چھوتے ہی اٹھتا ہے اک دھواں

پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بری — پہلو سے زلف مس ہو تو آتی ہے جھرجھری

سیال ہو رہی ہے سنبھلتا نہیں بدن — معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن

حضرت جوش عشق میں صرف ایک کے ہو کر رہ جانے کو poverty of

imagination اور اسے idealism سے تعبیر کرتے ہیں

جوش شاید صحیح ہے اس لئے کہ جس معاشرے میں مرد نے صدیوں سے عورت کے جسم و جاں

پر ڈاکے ڈالے ہوں ۔ وہاں عشق جسم ہی کے مرحلے طے کرتا ہے ۔ ذہن کے نہیں اس لئے

اگر جوش صاحب کا عشق اپنے طبقے کی خو بو لئے ہوئے ہے ۔ رفاقت کی نرم آنچ سے

محروم ہے تو اس میں تعجب کی بات نہیں ——— کیونکہ جس معاشرے میں یہی قدروں

کا فقدان ہو محبت گناہ و ثواب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو ۔ لذت کی سرشاری

پا بہ جولاں ہو ۔ جسم و جاں کی لطافتیں بکھرا ہوا کھول ہوں ۔ وہاں عورت کی بلندی و

پاکیزگی کی بات کاغذی تو ہو سکتی ہے لیکن عملی نہیں ۔ حضرت جوش نے بہانگ دہل عشق

کیا ۔ ان کا یہ رویہ اپنے طبقے کی دیرینہ روایت سے بغاوت ہے عشق میں جسم کی گرمی

اور روح کی پاکیزگی دونوں کو اچھوتے اسلوب میں بیان کرنا زندگی میں ایک مثبت قدر

کا اضافہ کرنا ہے ۔ جو گناہ و ثواب کے تمام آہنی حصاروں کو توڑ کر بے باکی و جرارت

کا حوصلہ عطا کرتی ہے ۔

جھوٹی قدروں کے صحرا میں جہاں سچ کے دو بول کہنا گناہ اور جھوٹ کا پرچار سربازار کرنا عین عبادت گردانا جاتا ہو وہاں حضرت جوش پر "عریانی" کا اتہام لگانا بہت معمولی سی بات ہے ـــــــ اور عادتوں کے علاوہ ذہن کی بھی عادت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں محبت مفلس کے جنازے کی طرح تنگ و تاریک گلیوں سے نکل سکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اسے روشنی میں لے آئے تو نگاہوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے۔ ہماری صدیوں کی ذہنی عادت کو ٹھیس لگتی ہے "اپنے معبدوں کی توہین کی بو" پا کر بھیا لوگ چھریاں گلے میں لٹکا کر گلی کوچے میں درانہ نکل آتے ہیں۔

چنانچہ ایک مقام پر شاعر ان کیفیات اور کشمکش کی عکاسی کرتا ہے جہاں ایک طرف محبت معاشرتی جبر کی زد پر ہے لیکن دوسری طرف جذبات کی مجبوریاں اسے محبوب کے در پر پہنچا دیتی ہیں۔

کوئی الہڑ گلی میں رات کو صد ہا جتن کرتی
ٹھٹھکتی ، ڈولتی ، تھمتی ، ٹھہرتی ، سسکیاں بھرتی
لرزتی ، ہانپتی ، رکتی ، بدکتی ، ہوکتی ، مرتی
سمٹتی ، کانپتی ، مڑتی ، جھجکتی ، جھینپتی ، ڈرتی
کسی کا در جب اک انگلی سے آکر کھٹکھٹاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حضرت جوش معاشرتی پابندیوں، ریاکاریوں اور دوہرے اخلاق کی بنا پر شادی کے ادارے کے بھی خلاف ہیں۔ ایک مکالمے میں جہاں لڑکی فرسودہ اقدار کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔ اور لڑکا اپنی مجبوریوں کے تحت اس کو پانے سے معذور ہے۔ اس وقت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔ لڑکی شادی شدہ ہے لڑکے سے ملنے سے انکار کرتی ہے۔

لڑکی۔ شادی کے بعد دل کو محبت کا حق نہیں۔

اختر پر جوش انداز میں۔

کیا کہا دل اور ہو درماندہ رسم و رواج
قلب سے حقِ محبت چھین لے اور ازدواج
ازدواج انسان کے دورِ ابلہیت کا شعار
ازدواج ایام وحشت کی بھیانک یادگار
حبس میدان طلب قحطِ دیارِ جستجو
محبس روح تمنا قبر ذوق آرزو
خستگیٔ عشق، اضمحلال شوق تندگاں
مقتل جذبات نورس مرگ سوز ناتمام
ایک قرب دائمی بیگانۂ رومانِ فصل
لذتِ ہجراں سے خالی اک مسلسل کربِ وصل
اک سفینۂ ست رو آشوبِ طوفاں کے بغیر
اک فریضہ مضمحل ہیجانِ عصیاں کے بغیر
الاماں یہ بدمزہ بے کیف شادی کا چلن
اک بندھا پانی اک جکڑا ہوا رخت کہن
جس میں یوں لپٹے ہوئے دو جسم رہتے ہیں صدا

بیشتر جو مدت سے پہلے نہیں ہوتے رہا
ہڈیاں چھپتی ہیں گو ایک دوسرے کے جسم کی
عمر بھر حاصل نہیں ہوتی ہے لیکن مخلصی
مشعلِ حسن و جوانی کو بجھا دیتا ہے جو
عشوۂ و انداز کی تعمیر ڈھا دیتا ہے جو
بامِ دارائی سے عورت کو گرا دیتا ہے جو
خانۂ شعور کا فرنیچر بنا دیتا ہے جو
حسن کے اجمال کو تفصیل کر دیتا ہے جو
آج یہ سو فیصدی بچے جو ناہنجار ہیں
قربت بالجبر کی دراصل پیدا وار ہیں
اس بحث سے قطع نظر جوش کے عشق میں سرشاری . . . . . .

اس میں شک نہیں کہ حضرت جوش کی عورت ان کے طبقے کی روایات کی اسیر ہے ان کے یہاں وہ عورت نہیں ابھرتی جو آزادی کی جدوجہد میں مرد کی شریک ہے اس لئے کہ عورت کی آزادی کا مسئلہ علیحدہ سے مسئلہ نہیں وہ سماج کی آزادی سے جڑا ہوا ہے ۔ جس وقت تک کہ معاشی ترتیب نہیں بدلتی ۔ وہ "پا بہ جولاں رہنے پر مجبور ہے۔ لیکن اس کمی کے باوجود حضرت جوش کی عورت صرف محبوبہ نہیں ۔ اس کے دوسرے روپ پر بھی ان کی نگاہ ہے ۔

عورت، ذہن و مزاج و تخمیر و قوام
نطق و وضع و شعور و تہذیب و خرام
جو ہاتھ ہے پالنے کی ڈوری کا امین
اس ہاتھ میں ہے نظام گیتی کی لگام

جس وقت محافظانِ تقدیس عصمت بنت مریم 'سنگساری' کا فیصلہ صادر کرتے ہیں تو حضرت جوش کا بے باک قلم اس طرح لرزاں و ترساں ہو کر مقابلے پر آتا ہے۔

معلول کو جس وقت تہ خاک کرو
علت کو بھی معلول و غم ناک کرو
جب زوجۂ زانیہ کا دامن پھاڑو
شوہر کے گریبان کو بھی چاک کرو

حضرت جوش محبت ہو یا زندگی کا کوئی اور رخ حقائق کو کیموفلاج کرنے کے قائل نہیں۔ اس لئے وہ محبت کے پاکیزہ جذبے کا اظہار بھی جرات کے ساتھ کرتے ہیں۔ تاریکی کو روشنی دکھا دیجئے تو اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جائے گی

"Slate & Heal" شیلا گراہم کی خود نوشت

جس وقت منظر عام پر آئی تو نقادان فن اور عوام نے اسکی تنقید نہیں بلکہ تنقیص نہیں کی۔ ٹھیکہ داروں نے فتوی صادر نہیں کئے۔ بلکہ فٹز جیرالڈ کی جذباتی زندگی اور اس کے مختلف پیچ و خم کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے باقاعدہ مہم شروع کی۔ کیا جوش اس مقام پر نہیں ہیں۔ جن کی زندگی کے ہر پہلو پر تحقیق کی جائے ؟

درمیان میں حضرت جوش ملیح آبادی دائیں جانب اردو کے ممتاز ادیب ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز (لندن)
سید محمد صادق ایڈووکیٹ (کانپور)۔ ممتاز شاعرہ سلطانہ مہر۔ کھڑے ہوئے محسن
بھوپالی۔ سید کاظم امام۔ سید محمد مسعود (ادیب ہانگ کانگ) محترم جمیل اختر لکچرار
کراچی یونیورسٹی ــــ پرنسپل پریمیئر کالج۔ ظفر مہدی، ممتاز شاعر سعید رضا سعید

مناظرِ فطرت

انسان کا رشتہ فطرت سے بہت پرانا ہے۔ ابتدا میں وہ اپنے ناپختہ شعور، کھردرے ذوقِ جمال، اور لاعلمی کے ہاتھوں فطرت کے قوانین کا پابند اور اسیر تھا ستاروں کی جگمگاہٹ نے تحیر کا جذبہ بیدار کیا۔ پہاڑوں نے اپنی عظمت کی دھاک بٹھائی گرج و چمک نے خوف کے جذبات جگائے۔ چاند کی روشنی نے محبت کی چاندنی چھٹکائی۔ کھیتوں نے جسم کو غذا، پانی نے سیرابی اور ہواؤں نے روح کو بالیدگی بخشی۔ فطرت سے معصوم لگاؤ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ سحر کو اوشا دیوی، دریا کو گنگا ماتا، اور بارش کو اندر دیوتا کا مقام بخش دیا۔ گورکی کے مطابق " انسان نے پہلے دیو مالا کے کردار تخلیق کئے عوامی ہیرو بہت بعد کی تخلیق ہیں۔"

قانونِ ارتقا کے تحت ہر نظریہ تغیر پذیر ہے۔ معاشرے کے پیداواری رشتوں کی تبدیلی سے نئے خیالات جنم لیتے ہیں۔ وقت و حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ دیوی دیوتا آسمانوں پر بٹھا دیئے گئے اور ان کی جگہ انسان دیوتا کے لقب سے سرفراز ہوا۔ ان میں بھی وہی صفات نظر آنے لگے جو دیوی اور دیوتاؤں میں تھے۔ تاریخی حالات کے تحت شعور نکھرتا گیا۔ دیوی دیوتاؤں کے تصورات میں بھی تبدیلی آئی۔ انسان کا رشتہ براہ راست زمین اور قدرت کی نشانیوں سے جڑنے لگا۔ تہوار فطرت سے ہم آہنگ ہوئے۔ نوروز، ہولی دیوالی، شبرات، بسنت سب کا رشتہ فطرت کی رعنائیوں میں گندھ گیا۔ زیورات میں بھی فطرت ہی کی معجزہ سامانیاں نظر آنے لگیں۔ تاریخ کے دھارے پر کبھی لوہا، کبھی تانبا، کبھی

سونا کبھی ہیرا اور پلاٹینم زیب تن ہوئے۔ راگ راگنیاں بھی موسموں اور وقت سے ہم آہنگ ہوئیں۔ "ان میں، کلیان نے شام کی بلوریں حسن سماعت کو غذا بخشی تو بھیرویں نے طلوع سحر سے اپنا بندھن استوار کیا۔

تاریخ نے مختلف کروٹیں لیں۔ قبائلی معاشرے نے غلامی کو جگہ دی۔ غلامی کی کوکھ سے جاگیرداری نے جنم لیا۔ جاگیرداری کے بطن سے سرمایہ داری نے ہوش سنبھالا اور سرمایہ نے محنت کو عظمت دینے کا تصور دیا۔ پیداواری رشتوں کی تبدیلی سے نئے پیمانے وضع ہوئے۔ نئے قانون تحریر ہوئے۔ نئے نظریات نے جنم لیا۔ رقص و موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ گو اپنی ابتدا میں معاشی رشتوں سے جڑے ہوئے تھے لیکن وضع قطع کھردری تھی۔ وقت کے ساتھ ان کے آہنگ میں بھی تبدیلی آئی۔ ذوقِ جمال کا تاریخی سفر خوب سے خوب تر کی منزل کی جانب بڑھتا گیا۔

جمالیات کی پرکھ کا معیار بدلتا گیا۔ سماج سے فنون لطیفہ کا رشتہ کبھی بہت گہرا اور کبھی مدھم ہوتا گیا۔ فطرت سے رشتہ استوار کرنے کے انداز میں بھی تغیر و تبدل ہوا۔ کل فطرت نے انسان کو مسخر کر لیا تھا۔ آج چاند اس کے زیرِ قدم ہے اور وہ مسکرا رہا ہے۔

حضرت جوش فطری طور پر حسن کے پرستار اور رسیا ہیں۔ حسن خواہ نمک ریز مکھڑوں، گھنگھروں کی جھنکار، جوبن کے ابھار، رادھا کی مسکراہٹ، کرشن کی مرلی میں، غارِ حرا کی خاموشی، مسیح کی صلیب، علی کے علم، حسین کی قربانی، مارکس کی فولادی عقل میں ہو۔ یا گل کترتی کیاریوں، بیلے کی کلیوں، پھول کی پنکھڑیوں، ٹیسو کے دہکتے پھول، گلابی جاڑے کی سرمئی دھوپ، رنگوں کی معطر وادی، طیور کی چہکار، سحر کی گلکاریوں میں ہو وہ کائنات کے ذرے ذرے کے حسن کو اس قدر جذب و عالمگیر محویت کے عالم میں دیکھتے ہیں کہ ان کا کلام عبادت کی سطح پر آجاتا ہے۔ جہاں اس میں از خود دریاؤں میں پیرنے، چٹانوں کو دو بنے اور کانٹوں میں پھول بن دیکھنے اور پوری صداقت کو اپنی گرفت میں لے لینے کی

صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سپیدہ سحر معرفت کے در اس طرح کھولتی ہے۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے،
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

صرف یہی نہیں بلکہ "فقد عرفہ نفسہ" "فقد عرفہ ربہ" کے برعکس یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ حسنِ کائنات کے ذریعے خدا کی ذات کو پہچانتے ہیں۔

ایک نامعلوم قوت ایک نادیدہ جلال
داغ شخصیت سے ہے ناآشنا جسکی جبیں
نوعِ انساں کے تعاون کی جسے حاجت نہیں
جس کا ہر تارہ ہے مصحف جسکا ہر ذرہ کتاب
جس کے دفتر کی ہے زریں مہر قرصِ آفتاب
وہ خدا وہ طاقتِ مخفی وہ دارئے حیات
جس کی اک ادنٰی سی جنبش کا لقب ہے کائنات
اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔

(دینِ آدمیت)

رابندر ناتھ ٹیگور نے حضرت جوش کی فطرت سے ذہنی لگاوٹ دیکھ کر انہیں "فرزندِ سحر گاہ" کا خطاب دیا تھا۔ حضرت جوش سحر کی معطر وادی میں صرف گھومتے نہیں ہیں بلکہ اس کے ایک ایک رنگین پور کو انہوں نے ٹٹولا ہے اور تخلیق کی گنگا جمنا بہائی ہے۔ عقل و خرد کی گتھیاں اس کے وسیلے سے سلجھائی ہیں۔ معنوی تہہ داری کے کر ردل طوفان اٹھائے ہیں۔ اور نئے تیشوں سے نئی انقلابی فکر کی نشاندہی کی ہے۔

خورشید ابھر رہا ہے یا صد ایوان
افلاک پہ آیات کے جنباں ہیں نشان

گیتی کو پیمبری کا منصب دینے
گردوں سے اتر رہا ہے گویا قرآں

ہر صبح با اندازِ دگر آتی ہے
تھالی میں لئے نئے گہر آتی ہے
ہر روز نکھرتی ہے افق پہ لیکن
ہر بار نئی دلہن نظر آتی ہے

غنچوں کی صبا گل کی ہنسی اوس کے گوہر
زرتار شفق سرد ہوا باغ معطر
رنگین ہوا۔ قوس قزح مہر منور
نغمے یہ پرندوں کے پہاڑوں کے یہ منظر

ہے کونسی خوبی جو جنوں میں نہیں ہے
کیا باغِ ارم صبح کے پہ تو میں نہیں ہے

کل صبح اٹھا باغ میں جب پردۂ خواب
اللہ ری نزاکتِ دل خانہ خراب
انفاس اٹھا سکے نہ بارِ خوشبو
پلکوں سے سنبھل سکا نہ بارِ مہتاب

گلشن میں یوں صبح کی افسوں کاری
ہر سمت ہے اک دجلۂ خوشبو جاری
ڈوبا نظر آتا ہے نظامِ آفاق
کتنی گہری ہے پنکھڑی کی دھاری

نغموں کے تلاطم سے ملے سناٹے
میخ کی جانب مڑے تو شعلے چاٹے
آنکھوں نے ہلال دل میں بوئے شب بھر
اور صبح کو آنسوؤں نے خنجر چاٹے

بدلی میں کھنک رہی ہے صبح کہسار
کرنوں میں دھواں ہے اور دھویں میں گلزار
اونچی تانیں اُگی ہوئی ہیں تا دور
یا ہنس رہی ہے یہ گھنے درختوں کی قطار

لپٹوں کے خزانوں کو لٹاتی آئی
سوتی ہوئی کلیوں کو جگاتی آئی
تخئیل کے دائرے میں جھنکتی پازیب
اس طرح نسیم گنگناتی آئی

ساحل پہ طلوع کا یہ جوبن، آہا
جھلمل جھلمل رقیق کندن، آہا
دھارے میں رواں دواں یہ گوٹا لچکا
لہروں میں جگر جگر یہ کنگن آہا

پھولوں میں ہے وہ صبح کی افسوں کاری
ہر سمت ہے اک دجلۂ خوشبو جاری
ڈوبا نظر آتا ہے نظامِ آفاق
کتنی گہری ہے پنکھڑی کی دھاری

کرنوں سے چھلک رہا ہے گیتی کا ایاغ
ذرات ہیں، یا لالۂ فردوس کے باغ
غُرفوں کے یہ شیشے ہیں کہ سونے کے وَرَق
شبنم کے یہ قطرے ہیں کہ مندر کے چراغ

گورے پنڈوں کی، نرم پیاری صُبحیں
پابندِ حیا، راج کماری صُبحیں
بیاہی صبحوں سے دل لگائے کیوں کر
جس کی محبوب ہوں کنواری صبحیں

یہ صبحِ سرِ کوہ، یہ ٹُھرداسن سن
ہر سمت یہ کُہرے کی لرزتی چلمن
یوں پھوٹ رہا ہے رنگ وادی جیسے
ململ کے ڈوپٹے سے ہمکتا جوبن

یہ وقتِ سحر، بھاؤ بتاتی ہوئی آگ
یہ سرد ہوا، یہ سنسناتی ہوئی آگ
گوکل میں بھٹک رہی ہیں گویا رادھا
یوں سُرخ الاؤ میں ہے گاتی ہوئی آگ

روایت جذبے کی اٹھان کے مانند آگے بڑھتی ہے۔ اور ستاروں کی سی کانپتی، جگمگاتی اور روحِ لذت گیر تصویریں بناتی چلی جاتی ہے۔ میر حسن نے اپنی مشہور مثنوی سحرالبیان، میں دلآرام کا "مجرا"، یوں دکھایا تھا۔

کناری کے جوڑے جھلکتے ہوئے — وہ پاؤں کے گھنگھرو جھنکتے ہوئے
وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ — دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ
ڈوپٹہ کو کرنا کبھی منہ کی اوٹ — کہ پردے میں ہو جائے دل لوٹ پوٹ

اور راگ رنگ کا عطر یوں برسایا۔

وہ ایمن کی تانیں ادھر اور اُدھر
ملے سُر طنبوروں کے بایک دگر
اولٹنا وہ ٹھوکر کو دے دے کے تال
وہ لوٹا سا قد اور کہروے کی چال

جوش صاحب نے اس خوبصورت روایت سے رشتہ جوڑ کر زعفران جسم کے تبسم کی خوبصورت پھوار سینے کے سنہرے صندل اور جھرجھری لیتی کنول کی جھیل کے سامنے دل کے کٹوروں کی شراب یوں چھلکا دی ہے۔

ہاں اٹھالے روحِ موسیقی ربابِ زرفشاں
رقص کی تشریح پہ مائل ہے شاعر کی زباں
رقص کیا ہے، خاک کے دل میں خروشِ کائنات
پیکرِ فانی میں گرمِ ناز، لافانی حیات

چاندنی میں جوئے شیریں جیسے تھم تھم کر بہے
انکھڑیوں کی شعر گوئی سا عدوں کے زمزمے
خون میں لہروں پہ لہریں لحنِ بے آواز کی
لغزشوں پر لغزشیں مشقِ خرامِ ناز کی

خیر سمجھا دوں، ذرا لانا تو مینائے شراب
رقص کس موقعے پہ چہرے سے الٹتا ہے نقاب
رقص ہے دراصل برنائی کا لحنِ بے خروش
قلبِ نازک میں تمنائے ہم آغوشی کا جوش
خون کی گردش میں رہ رہ کر برنگِ زیر و بم
حوصلوں کی بے قراری، ولولوں کا پیچ و خم
جوئے طوفاں خیز کے سانچے میں ڈھلنے کی اُمنگ
بھینچ کے آغوشِ تمنّا میں مچلنے کی اُمنگ
خال و خد کی نغمہ ریزی، ابروؤں کی گفتگو
نرگسِ مخمور میں طغیانِ شرح کی آرزو
جوشش آلبس خاموش ہو پیمانہ بھرنے دے مجھے
جھوم کر بربط اٹھا اور رقص کرنے دے مجھے

سی ایم بورا نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف " رومانی تخیل " میں رومانیت اور کلاسکیت سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " رومانیت " کی اہم خصوصیت تخیل کی پرستش ہے۔ " اٹھارویں صدی کا انگلستان ٹھہرا ہوا تھا۔ اس میں جمود کی سی کیفیت تھی۔ تازہ ہوا اور روشنی پر بادبان پر پھیلائے کھڑا تھا۔ خیال پابہ زنجیر اور جذبہ پابہ سلاسل تھا۔ پورا سماج پیاس کا لق و دق صحرا تھا۔ جس میں تری وشادابی نہیں تھی۔ صنعتی انقلاب کی تکمیل کے بعد پیاسی روح کی شدت بڑھ گئی۔ زندگی لوہے کے جال میں جکڑی نظر آنے لگی۔ چنانچہ شعرا نے خیالی سطح پر زنجیروں کو توڑ کر فضا میں پرواز کرنا شروع کر دیا۔ بلیک صوفی خیالات میں گھر گیا۔ شیلے اور کیٹس طائر آزاد کی طرح اڑنے لگا۔ ورڈس ورتھ نے فطرت سے رشتہ جوڑا۔ ان شعرا کے نغموں میں وحدت فکر ہے۔ جو تخیل پر پابندی کے خلاف برسر پیکار ہے۔ یہ سب رومانیت پرست تھے۔ رومانیت نے جذبے کی گرمی سے نگارستاں آزادگاں بنایا۔ لیکن ساتھ ہی حقائق سے یا تو رشتہ توڑ لیا یا جذبات کے لطیف پہلوؤں کو حقیقت کی ٹھوس چٹانوں سے ٹکرانے سے روک دیا۔ جزو کو کل سے بڑھا دیا۔ جو سماجی نقطۂ نگاہ سے مضر بھی ہے اور خطرناک بھی۔ کیونکہ خیال اور مادے کی کشمکش میں خیال کو مادے پر ترجیح دینا غیر صحت مند ہے۔

جوش صاحب جذبے کی گرمی، تخیل کی پرواز اور آزادی خیال کے پرستار اور گلشن پرست ہیں۔ پھول اور کانٹے دونوں ان کے یہاں ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ان کی فطرت پرستی انہیں راہ فرار نہیں دکھاتی بلکہ ان کی فکر فوارے کی مانند ہے جو بلند ہوتا ہے۔ لیکن زمین سے نہ صرف یہ کہ رشتہ نہیں توڑتا بلکہ اسے تری تازگی اور فرحت بخشتا ہے۔ نظروں کو گرمی اور فکر کو لطافت سے سرشار کرتا ہے۔

حضرت جوش کا فطرت سے والہانہ لگاؤ میر انیس اور نظیر اکبر آبادی کی روایات سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن محسوس یوں ہوتا ہے کہ جوش کا کینوس شاید ان دونوں سے بڑا ہے۔ جوش کی شاعری کے کینوس پر قوس و قزح، رنگ و بو، زمینی نیرنگیوں کا

ایک "میدان حشر" اور ایک عالم آباد ہے۔ جس میں امیر و غریب، صنعت کار مزدور، عالم و جاہل، جھریاں پڑی ہوئی عورتیں، بلکتے ہوئے معصوم چہرے، جگمگاتی سڑکیں، اندھیری گلیاں، ہنستا اور بسورتا آدمی، ظالم اور مظلوم، سرمست اور دردناک زندگی کے ہر رخ کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جوش کی منظر نگاری کے دائرے میں ہندوستان کا ذرہ ذرہ ریشم اور سوت کے دھاگوں میں بنا ہوا نظر کے سامنے آتا ہے۔ جس میں گڑ کی بھیلیاں، کھپریل کی چھتیں، پھوس کے مکان، بچوں کے جھنجھنے، ماؤں کی لوریاں، قہقہے اگلتے ہوئے ایوان ریشم کے سرسراتے کپڑے سب ہی کچھ ہیں۔ جوش کی فطرت پرستی فرار نہیں وہ قدرت کی صرف عکاس نہیں۔ بلکہ وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ مناظر فطرت کا رشتہ انسانوں سے کیا ہے؟ ان کا اس کی طرف جذباتی ردِ عمل کیا ہے؟ انسانی جذبات و احساسات پہ مناظر کی سحر کاری کا کیا انداز ہوتا ہے؟ جوش کا قلم یہاں معجزہ سامانیاں دکھاتا ہے اور جیتا جاگتا، جہان نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔
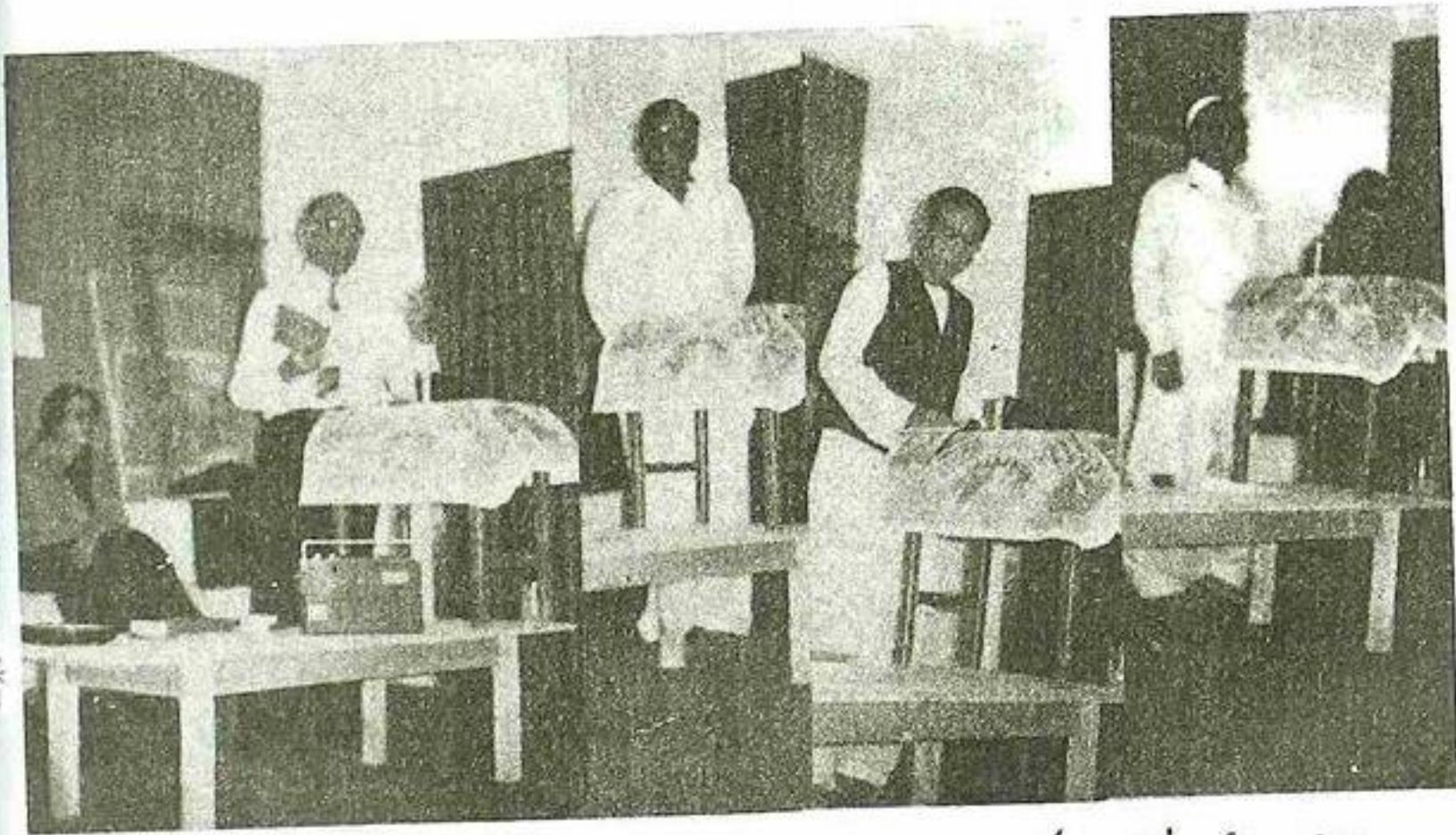
حضرت جوش ملیح آبادی کی یاد میں جلسے سے مقررین خطاب کر رہے ہیں (ریاض سعودی عرب)
ڈاکٹر عالیہ امام۔ سید حسن مصطفیٰ۔ محترم ابرار زیدی۔ سید فاروق۔ محترم رضوی صاحب

شور ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی غبار | بیل گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ گُڑ کی بو مرچوں کی دھانس | خربزے، آلو، کھلی، گیہوں کدو، تربوز گھانس
ماؤں کے کاندھوں پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے | بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے
لُو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی | دوستوں کی شکل پہ بیگانگی چھائی ہوئی

سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پہ عکسِ گناہ
تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

(گرمی اور دیہاتی بازار)

یہاں ہندوستان کے ہر قصبے و دیہات کا منظر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

جنگلوں کے سرد گوشے ریل بل کھاتی ہوئی | جہل کے سینے پہ زلفِ علم لہراتی ہوئی
بزم وحشت میں تمدن ناز فرماتا ہوا | تند انجن کا دھواں میداں پہ بل کھاتا ہوا
الاماں دنیائے نادانی میں دانائی کا زور | بھاپ کی پھنکار لوہے کی گرج پانی کا شور

ایک اسٹیشن افسردہ مضمحل تنہا اداس
جھٹپٹے کی بدلیاں پر ہول جنگل آس پاس

قدِ آدم گھاس گہری ندیاں اونچے پہاڑ | ایک اسٹیشن فقط لے دے کے باقی سب اجاڑ

کاش جا کر بابو سے جوش یہ پوچھے کوئی
جنگلوں میں کٹ رہی ہے کس طرح سے زندگی؟

(بن باسی بابو)

حضرت جوش کا قلم ہندوستانی مناظر کو چھوتے ہوئے اس طرح رقص کرتا ہے

وہ چھوکرے ادب سے دروں میں کھڑے ہوئے — دایاؤں کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے
ماماؤں کی صفوں میں وہ منگلانیوں کی شان — رکھا ہوا وہ تخت پہ چاندی کا پاندان
وہ پھیرے گرد و پیش بصد شان افتخار — آواز پان دان کے کھلنے کی بار بار
وہ پیکلیں گلوں میں لبوں پہ وہ لالیاں — ہلتی ہوئی وہ کانوں میں سونے کی بالیاں
وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھسے ہوئے — رعب آفریں دروں میں وہ پردے چھٹے ہوئے
وہ نچلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار — پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار

"جاڑا اور انگیٹھی"

ان نظموں میں نہ صرف یہ کہ منظر کی دلکشی و سادگی ہے۔ بلکہ ہندوستان کے تمام شناسا اور ناشناسا پہلوؤں کی عکاسی بھی ہے لیکن اس طرح کہ سماجی پس منظر میں نقشہ ابھرتا ہے "جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ" کہکر سود خوار نظام پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ ساتھ ہی جاگیردارانہ نظام کی فراغت اور اس کے تہذیبی رکھ رکھاؤ طبقاتی اونچ نیچ کے فرق کو جاڑا اور انگیٹھی، میں جس طرح جوش صاحب نے ابھارا ہے اس سے اس عہد کی گنگناتی یادوں کی لاکھوں لوئیں جل اٹھتی ہیں۔

محاکات کا بیان حضرت جوش کا حصہ ہے۔ "کائنات ان کے لئے صحیفۂ قدرت اور کلام خدا ہے۔ انسانی جذبات و محسوسات پر مناظر کی سحر کاری شاعرانہ لطافت کے ساتھ دکھانا کہ ایک دھڑکتی اور سانس لیتی ہوئی فضا تخلیق ہو جائے حضرت جوش کے قلم کا ایک ایسا اعجاز ہے جس میں سوائے میر انیس کے کوئی ان کا ہمعصر نہیں۔

مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹائیں بجلی
آنکھ سی کوہ بیاباں کی جھپک جاتی ہے

"ذمی حیات مناظر"

کسان تہذیبی تاریخ کی ایک مسلسل کہانی ہے ۔ وہ چکی کا ایسا کھونٹا ہے جس پر معاشرے کی گردش کا دار مدار ہے لیکن اس طبقے کے ہاتھوں جس کی گردن کی رسی ڈھیلی ہوتی ہے اور جسے کھلے ہوئے جانور کی طرح اپنے چارے دانے کے علاوہ عام انسانوں کی فکر نہیں ہوتی ۔ ان کے ہاتھوں کسان کی زندگی بگولا اٹھتا ہوا ریگزار ہے جوش کے سحر آفریں قلم نے قدرتی مناظر کے پس منظر میں سوت اور ریشم دونوں دھاگے لگائے ہیں لیکن اس طرح کہ دونوں کسی مقام پر خلط ملط نہیں ہوتے ۔ انہوں نے اردو ادب میں پہلی مرتبہ کسان کو عظمت کا وہ تاج پہنایا جس کا وہ صدیوں سے حقدار تھا ۔ عجیب دلفریب انداز میں منظر سامنے آتا ہے ۔

چھٹ پٹے کا نرم رو دریا شفق کا اضطراب
کھتیاں میدان خاموشی غروب آفتاب
پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی
خون ہے جس کی روانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتی ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب
یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
طفل باراں، تاجدارِ خاک، امیر بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بوئے گلشن پناہ
نازِ پروردہ لہلاتی کھتیوں کا بادشاہ

وارثِ اسرارِ فطرت ، فاتحِ امید و بیم
محرمِ آثارِ باراں ، واقفِ طبعِ نسیم
خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جسکے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب
خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب
دوڑتی ہے رات کو جسکی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جسکی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک
جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک
خون جسکا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جسکی محنت سے پھبکتا ہے تنِ آسانی کا باغ
جسکی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

ہل کی عظمت شاعر یوں بیان کرتا ہے۔

کون ہل ، ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ سینۂ گیتی کا دل
خوش نما شہروں کا بانی ، رازِ فطرت کا چراغ
خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام

شام زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مخمل ذروں کو ، موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کا حسن خاشاک میں بنتا ہے اک چادرِ مہین
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمین ۔

اپنی نظم ، اکتارہ ، میں آنسوؤں کی راگنی کو شاعر اس طرح قلمبند کرتا ہے ۔

برق پرور زندگی وابستۂ صد پیچ و تاب
ابر کی باریک چادر ، دوپہر کا آفتاب
حاشیئے پر شہر کے ، اک باغ ، ویران و تباہ
باغ کے دامن میں اک اُجڑی ہوئی سی شاہراہ
گامزن اس راستے پر ایک پیرِ ناتواں
ہات میں ،، اکتارہ ،، لب پر راگنی کی سسکیاں
تند و تیز جھونکوں کے شانے پر حرارت کا دباؤ
لرزشوں سے تار کی بھیگی فضا میں اک کسک
ابتدائے عشق میں جس طرح نبضوں کی دھمک
دے تو دوں تشبیہہ، لیکن کس کو آئیگا یقین
آنسوؤں کی راگنی سے انجمن واقف نہیں
اس مزے کے ساتھ جاں افروز تانیں مضمحل
کروٹیں سینے میں لے جس کر بسے شاعر کا دل
یوں لرزتے ساز کے بے چین شبے دلنشیں
پینگ لے جس طرح کوئی فتنۂ دنیا و دیں

انتروں میں جھٹپٹے کے وقت کی سی آب جو
زیر و بم کے لوچ میں رفتارِ نبضِ آرزو
راگنی کی نرم لہریں، جاگتی سوتی ہوئی
بہہ رہی ہیں پردہ ہائے دل سے مس ہوتی ہوئی
ذرّہ ذرّہ اک نئے سانچے میں ڈھلنے کے قریب
عالمِ اسباب ہے گویا پگھلنے کے قریب

قدرت کے بے بہا خزینوں میں پانی بڑی دولت ہے۔ اساطیر اور مذاہب عالم میں اس کی اہمیت پر دفتر موجود ہیں۔ ہندوؤں کے یہاں پانی گنگا ماتا ہے عیسائیوں کے یہاں بتسما اور مسلمانوں کے یہاں حرم میں داخلے کے لئے پانی کا استعمال اس کی پاکیزگی کی طرف بلیغ اشارے ہیں۔ گناہوں کو دھونے، غلاظت سے پاک کرنے اور خیر کی قوتوں کو بڑھاوا دینے میں پانی کی اہمیت مسلم ہے۔ ٹوئن بی کے مطابق دنیا کی تمام تہذیبوں نے سب سے پہلے جنم پانی ہی کے ارد گرد لیا۔

حضرت جوش نے فطرت کی اس دولت کو کبھی غنچوں کے ہونٹوں پر بکھرتے، کبھی پھولوں میں ہنستے، کبھی سکون اور وقار دیتے اور کبھی ہر طور زندگی بخشتے ہوئے دیکھا ہے صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اسے خیر و شر کی قوتوں کے ٹکراؤ کی صورت میں بھی دیکھا۔ اس طرح کہ حیات نو کی تخلیق میں پوری فضا لوچتی نظر آتی ہے۔

پانی ہزار روپ سے ہوتا ہے منجلی — شبنم، بہار، گونج، گرج، راگنی، جھڑی
بالی، درخت، دوب، ثمر، برگ، خس، کلی — کونپل، شگوفہ، گاہ، کلی، پھول، پنکھڑی

کرتا ہے نصب موج پہ خیمے حباب کے
بھرتا ہے صبح وقت کٹورے گلاب کے

پانی کا لوچ، ابر کی رَو، موتیوں کی آب — مٹی کی جان گُل کی مہک، بحر کا حجاب
ساغر کی آگ تیغ کا پانی، سمن کی داب — کڑکے تو موجِ صاعقہ، کھنچ جائے تو شراب
پُروا میں ابرِ تیرہ کے لکّے بنے ہوئے
لیلائے برشگال کی چُندری چُنے ہوئے

مشّلِ بہار اُڑے تو گھٹائیں ہوں نغمہ گر — خُم سے اُبل پڑے تو مہک جائیں بام و در
امنڈے تو رنگ و رقص ہوں گنگا کے گھاٹ پر — چھلکے جو گاگروں سے گھٹائیں ہوں تر بتر
نہلائے الہڑوں کو پنڈ سے بکس پڑیں
ٹپکے جو گیسوؤں سے تو موتی برس پڑیں

پانی کی صفات گنانے کے بعد شاعر اسی پانی کی روانی میں "تشنہ دہانی کا عزم دکھاتا ہے ـــ جو اعلیٰ مقصدِ حیات کی نگہبان ہے اور تاریکی کو کاٹ کر اجالا پھیلا رہی ہے۔

مسکن جو تھے غرور کے وہ سر جھکا دیئے — ایوانِ خسروی کے پرخچے اڑا دیئے
لب تشنگی نے خون کے دریا بہا دیئے — پیاسے نے آبِ تیغ کے جوہر دکھا دیئے
برپا دیارِ کفر میں کہرام ہو گیا
دیوِ فساد لرزہ براندام ہو گیا
شیرازۂ کتابِ حکومت بکھر گیا — سلطان کے غرور کا دریا اتر گیا
کردار تشنہ کام بڑا کام کر گیا — پانی سیاہ شام کے سر سے گذر گیا
حق کی نگاہِ ضرب سے بے تاب ہو گئے
باطل کے پیروؤں کے جگر آب ہو گئے

پل بھر میں سانس اہلِ جفا کی اکھڑ گئی — بیعت کی طمطراق کی صورت بگڑ گئی
دستِ خدا سے کسوتِ شاہی اُدھڑ گئی — دربار پر بحکم قضا اوس پڑ گئی
حق نے رگِ سقیفہ کی چھل بل نکال دی
پائے بنی امیہ میں زنجیر ڈال دی۔

تاریکی علم سوز، جہل افروز اور گوہر شکن ہے۔ روشنی شر بیزار، خیر پرستار اور جہل سوز ہے۔ روشنی زندگی کی نمو اور تاریکی ٹھٹھرن ہے۔ روشنی مٹی کی سوندھی خوشبو دھان کی فصل، اور حق کا نبوت بخش مکھڑا ہے۔ دنیا کی تمام الہامی کتابوں میں آفتاب کی روشنی کو غیر معمولی فضیلت دی گئی ہے۔ کائنات کے تخلیقی عمل کی کہانی کو اگر تسلسل کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ روشنی کو تخلیق اسی لئے کیا گیا تاکہ وہ تاریکی کو کاٹ دے۔ اندھیرے کو چھانٹ دے اور گناہوں کی آلودگی سے سرزمین کو پاک کر دے۔

"ژند اوستا میں "روشنی کی تعریف اس طرح ہوتی ہے ___ "جب آفتاب طلوع ہوتا ہے اس کی کرنیں بکھرتی ہیں تو زمین اور کھڑا پانی دونوں کو پاک کر دیتی ہیں...... اس طرح مخلوق کی تطہیر کرتی ہیں۔"

قرآن مجید میں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کی آیت میں طلوع آفتاب کی فضیلت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے بدی سمٹی اور خیر پھیل گیا۔ ہندو دیو مالاؤں اور قدیم اساطیر میں سورج کو باپ اور دیوتا تسلیم کیا گیا ہے۔ یعنی روشنی کل بھی بھٹکے ہوؤں کو منزل کا پتہ دیتی تھی اور آج بھی، کل بھی زندگی میں توانائی اور حسن بکھیرتی تھی اور آج بھی۔

حضرت جوش حیات و کائنات کے رشتوں کے عارف ہیں۔ فطرت کا ہمراز ہونا زندگی کی بنیادوں میں استواری اور حسن و رعنائی بخشتا ہے۔ انسانیت کے ذخیرے میں موتیوں کا اضافہ کرتا ہے۔ فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کے ادراک کے ساتھ فطرت کی سچائیوں کو گرفت میں کرنا، کثرت میں وحدت پالینا۔ قدرت کے پس منظر میں زندگی کے لبوں سے شیریں نغمے بیدار کرنا کمالِ بصیرت اور فن کی دلیل ہے۔

انہوں نے اندھیرے اور اجالے کو صرف دکھایا نہیں
بلکہ اس کی درستگی اور نادرستگی کا جائزہ بھی اظہار کی رعنائی اور دل آویزی کے ساتھ لیا ہے ۔

سازِ شب سے نغمہ ہائے صبح دم پیدا ہوئے
بستیاں مڑنے لگیں گلیوں میں خم پیدا ہوئے

ظلمتوں کے ٹھٹ لگے تھے روشنی کے سامنے
موت منہ کھولے کھڑی تھی زندگی کے سامنے

لے رہی تھی پینگ تاریکی دلوں کے شہر میں
بہہ رہی تھی دھوپ صلح و آشتی کی نہر میں

شاہراہِ عام تر شی مانگ نکلی شہر کی
روشنی کی موج نے اس مانگ میں افشاں بھری

تابِ افشاں جدولِ منقش میں ڈھل کر بہی
زندگی کی نبض ذوقِ شب روی چلنے لگی

سازِ شب سے نغمہ ہائے صبح دم پیدا ہوئے
بستیاں مڑنے لگیں گلیوں میں خم پیدا ہوئے

گھر چکی تھی تیرگی کی یورشوں میں شمعِ طور
شعلہ ہائے روشنی ہونے ہی کو تھے چور چور

زلزلوں کی حکمرانی تھی زمیں پر دور دور
ہل رہے تھے قصر ہائے مقبلانِ ذی شعور

پختہ کارانِ جہاں بھی صیدِ فکرِ خام تھے
انبیاءِ عرشِ بریں پر لرزہ بر اندام تھے

تیرگی کی جیب میں تھی دولتِ شمس و قمر
جل رہا تھا خانۂ دیرینۂ فکر و نظر

زندگی پر یوں جہنم کا تسلط دیکھ کر
اک عظیم انسان بہرِ خدمتِ نوعِ بشر

رنگ بھرے زندگی کے نقش میں قانون کا
دوش پر لے کر سبو آیا خود اپنے خون کا

روشنی کا بیان اظہار کی دلآویزی کے ساتھ کیا ہے۔ تیرگی اور روشنی کے تصادم کے نتیجے میں
نئی زندگی جنم لیتی ہے۔ تیرگی سمٹتی اور روشنی بڑھتی ہے۔ چھلکتی ہے۔

آگ قدرت کا کرشمہ، ذہن کی شعلگی، خوابوں کی تعبیر، کائنات کی مسکراہٹ
بصیرت کی علامت، انا کی پہچان، گبر کا ایمان، برہمن کا یقین ہے۔ "آگ آلودگی
کو جلا کر راکھ بنا دیتی ہے۔ اس راکھ سے شمعیں جل اٹھتی ہیں اور چراغاں ہوتا ہے۔
شاعری زندگی کا حسی ادراک، انسانی مسرتوں تک رسائی، نئی سحر کی نوید
بیداری کا ثمر ہے۔ فطرت ہمیشہ سے بے سکون ہے۔ زندگی کی ہلچل اور ہنگاموں کو فطرت
سے ہم آہنگ بنا کر شاعری نے اسے معنویت بخشی ہے۔ حضرت جوش کی شاعری مشینی عہد
کی تہہ بہ تہہ مسائل کی گتھیاں سلجھانے کا سلیقہ بھی ہے۔ فطرت کے حوالے سے مستقبل کی طرف
بلیغ اشارہ بھی، زندگی کی کلیت کی دریافت بھی اور انسانی مسرتوں کو پالینے کا یقین
بھی۔ فطرت کے خد و خال کا مطالعہ کرتے وقت انہوں نے انسانی رشتوں سے مطابقت پیدا
کر کے زندگی کو معنویت بخشی ہے۔ اپنی نظم "آگ" میں انہوں نے "گمان"، "ولیقین"
کے پہلوؤں کو زندگی کی بھرپور علامتوں سے شکست درخت کے عمل کو دکھایا ہے جذبے و
احساس کے ساتھ آگ کی اولین و آخری شعاع کو گرفت میں کیا ہے۔

اودھیا کی جلوہ باری، انبیا کی روشنی
گبر کا ایمان۔ ترسا کے خدا کی روشنی

شمع کی ضو میں یقیں، گرراب کی رو میں گماں　　آگ حرفِ اولینِ خطبۂ خلاقِ جہاں

ہاں نخستیں شمعِ جاں افروز، دل کے طاق کی

سب سے پہلی مسکراہٹ لیلیٔ آفاق کی

اور سرتابی کا جب ہیجان بن جاتی ہے آگ　　اک قیامت آخرش طوفان بن جاتی ہے آگ

گمرہی کا آتشیں میلان بن جاتی ہے آگ　　از درِ عفریت کیا شیطان بن جاتی ہے آگ

بندگی کو نذرِ استکبار کر دیتی ہے آگ

حکم دیتا ہے خدا انکار کر دیتی ہے آگ

اور جب خوش ہو تو پیغام بقا دیتی ہے آگ　　زندگی کو اپنے دامن کی ہوا دیتی ہے آگ

ظلمتوں کو دولتِ نور و ضیا دیتی ہے آگ　　سنگ کو یاقوت احمر کو قبا دیتی ہے آگ

اور اسے ڈھونڈو تو فرِ سروری دیتی ہے آگ

سروری کیا چیز ہے، پیغمبری دیتی ہے آگ

حضرت جوش کو فطرت سے جو گہرا ارتباط ہے وہ تخیلی نہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی جھلکتا ہے۔ اس نفسیات کا سماجی پس منظر ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان کی فطرت نگاری میں چونکا دینے کی کیفیت ہے جس سے جذبات میں ارتعاش اور شعور میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ موضوع کے حسن کے ساتھ ان کا پیرایہ بھی دلاویز ہے جو جذب کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ کر روایتوں کے تسلسل سے رشتہ جوڑتا ہے قدرت کی صداقتوں کو گرفت میں لیتا ہے اور یوں مفسرِ روحِ کائنات بن جاتا ہے۔

قید غفلت سے زندگی چھوٹ گئی　　چھائی ہوئی ظلمت کی کمر ٹوٹ گئی

دوشیزۂ صبح نے بپیڑے جو ملے　　لو پھٹ گئی زرتار کرن پھوٹ گئی

محسوسات کی تجسیم ملاحظہ ہو۔

جب رات کو جھومتے ہیں بادل کالے
ظلمت میں تپکتے ہیں دلوں کے چھالے
قربان ترے اس وقت کی تاریکی میں
انگشتِ سحر سے دل کو چھونے والے

اس میں شک نہیں کہ جوش نے فطرت کی رعنائیوں، اس کی گوناگوں اداؤں کو آتشیں استعاروں، اور دل آویز تشبیہوں میں رقم کیا۔ لیکن فطرت سے اس قدر وارفتگی کے باوجود انہوں نے ہر قدم پر سماجی حقیقت نگاری کو اپنا امام بنایا۔ مناظر فطرت کی رعنائیوں کے تناظر میں سماجی ناانصاف کے ہاتھوں کس طرح زندگی فٹ پاتھ پر پڑی کراہ رہی ہے۔ اور آزادی و غلامی کے درمیاں روشنی کی لکیر کہاں کھنچتی ہے۔ اس کی نشاندہی کی اور انہوں نے اردو ادب میں غالباً پہلی مرتبہ حسنِ فطرت کو بھی انقلابی بصیرت و بصارت بخشی۔

کل صبح کو بُتان نے پکارا مجھ کو
بازارِ نگاراں نے پکارا مجھ کو
روندی ہوئی پتی پہ جبائے جو نگاہ
سرکارِ بہاراں نے پکارا مجھ کو

دمکائی ہے سورج نے ابھی نصف جبیں
سوسن ہے فضا، فرشِ زمیں ہے نسریں
پٹری پہ جو غلطاں ہے یہ ننھی سی کرن
ڈرتا ہوں کہ ریل سے نہ کٹ جائے کہیں

جب رات سے ہوتی ہے سحر بر سرِ جنگ
اٹھتی ہے دلِ تپیاں میں یوں طرفہ اُمنگ
جلتے کاغذ کی لو کے آگے آگے
جیسے چلتا ہے ایک باریک سا رنگ

آج تو فاختہ کی نرم آواز
جیسے پیری میں یادِ طفلی آئے
جیسے یعقوب غرقِ شہول میں
شب کو جس طرح دل میں درد اٹھے
شام کو زیرِ سایۂ کہسار
جیسے اشکوں کی لہر سینے میں
جیسے سسرال میں کو لڑکی
صبح پنگھٹ کو نیم کے نیچے

ہے کچھ اس طرح غرقِ سوز و گداز
جیسے جل جل کے شمع بجھ جائے
جیسے سیتا کی جستجو بن میں
بیوگی نو عروس کی جیسے
جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار
پانی آنے لگے سفینے میں
دیکھ کر بدلیوں کو ساون کی
مائکے کی گھٹائیں یاد کرے

جب شام کو جوئے خستہ بل کھاتی ہے
لہروں کی کراہ سر پہ منڈلاتی ہے
کس ناؤ کے ڈوبنے کی دل پر ہے یہ چوٹ
ساحل کی ہوا کھائی نہیں جاتی ہے

خمریات

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ وہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

فن کار کا ذہن اپنی کسی کبھی کیفیت ، فنی لطافت ، خیال کی نزاکت ، مشاہدہ کی قوت اور تجربے کی وسعت ، کا ادراک خارج سے بے نیاز ہو کر نہیں کر سکتا وہ اپنے فنی شعور کے لئے اور تخلیقی تسکین کے لئے گرد و پیش اور ماضی کے صحت مند خزینوں کا مرہون منت ہے ۔ تہذیبی روایات جس میں اسے انتخاب و اجتناب کا حق حاصل ہے اس کے ذہنی پس منظر کا جزو ضرور بنتی ہیں ۔ رند مشربی کی روایت اردو ادب میں عام ہے ۔ یہ روایت ایرانی تہذیب سے جذباتی و ذہنی ہم آہنگی کے حوالے سے ہمارے ادب میں داخل ہوئی ۔ ہندوستان کی زمین زرخیز تھی ۔ اسے اچھی کھاد اور پانی کی ضرورت تھی اجنبی خیالات سر راہ بننے کے بجائے جڑوں میں پیوست ہو گئے ۔ حافظ و خیام و عرفی کے خیالات کو ذہنِ فعال concious intellect نے لبیک کہا اور اردو زبان نے فارسی کی اس روایت کو اپنایا ۔

چوں گلِ رخسار و دست آتشِ مے بر فروخت
شمع شبستاں گداخت رنگِ گلستاں شکست

ہماری شاعری خواہ فارسی میں ہو یا اردو میں۔ اس میں دو پہلو نمایاں ہیں۔ ایک وہ جو ہمارے مخصوص مذہبی تصورات پر روایتی اظہار ہے۔ دوسرا تنقیدی مذہب پر چونکہ باطنی قوتوں کی حکمرانی تھی۔ مسجد سے مکتب تک وہ ان پر حاوی ہے اس لیے زاہد، شیخ، ملا مفتی اور دیگر کردار مذہب کی وساطت سے طنز و مزاح کا موضوع بنے۔ فارسی اور اردو شعراء نے ان کرداروں کے دوہرے اخلاق کی تہیں کھول کر مذہبی اور قومی خدمت انجام دی کیونکہ یہ افراد اور ادارے معصوم انسانوں کے عقائد سے کھیل کر اپنی زندگی میں تر نوالہ تیار کرتے ہیں۔ جو آج بھی جاری ہے۔ اس لیے ان اداروں پر شدید ضرب لگانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ فارسی میں مولانا روم سے لے کر بیدل تک سب نے ان مذہبی اداروں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔

ہمارے عہد میں اقبال کے بعد جوش نے تیکھے انداز میں اس موضوع کو اپنایا۔ ان کے مزاج کی شوخی کی کیفیت وہی ہے جو غالب کی تھی انتہائی لطیف و شگفتہ ــــ غالب کی شوخی کا شائبہ اقبال میں بھی تھا۔ لیکن ان کی سنجیدہ مزاجی حاوی ہوئی اور وہ فکر و فلسفے کی طرف چلے گئے۔ غالب نے "مشاہدۂ حق" کی گفتگو کے لئے "بادہ و ساغر" کو لازم قرار دیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ سب اشارے علامات ہیں جنہیں فنکار اپنے مشاہدے اور تجربات کے اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن انھیں بذات خود مقصد و موضوع سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ غالب "حیوان ظریف" ہے۔ شوخی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ واعظ کے دوہرے کردار پر بھرپور انداز میں یوں طنز کرتے ہیں۔

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کہ کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب کے بعد اس موضوع پر اعلیٰ معیار کا طنز صرف جوش نے کیا اور اس کے بعد فیض نے بھی اسی چراغ سے چراغ جلایا۔

شیخ صاحب سے راہ و رسم نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

خیر جنت میں ملے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جان تو چھوٹے گی

شراب و مشاہد حضرت جوش کے محبوب موضوع ہیں۔ جس کے تصور سے وادیٔ کہساران کے افق ذہن پر طلوع ہو جاتی ہے۔ رگ و پے میں خون گنگنانے لگتا ہے خشک پتے گر جاتے ہیں۔ نئی کونپلیں پھوٹتی، ابلاغ کے نئے کنول کھلتے ہیں عقائد کی پیشانی عرق ریز ہو جاتی ہے۔ منطق و براہین کے ترازو میں تول کر شراب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

" ہر وہ چیز جو زود اثر ہوتی ہے جو خون کی رفتار میں غیر معمولی گرمی پیدا کرتی ہے اور اسے تیز کرتی ہے۔ اسے سکر یا نشہ کہا جاتا ہے۔ کنول سونگھنا، کوکو اور پی ہو پر جھومنا، رم جھم میں لہرانا، بچوں اور محبوبہ کو گلے سے لگانا، نغمے یا قرأت سننا اور وجد کرنا، ایمان صادق کے لئے گلا کٹوانا، اعلیٰ مقصد کے لئے جام شہادت پینا، آسمانی کتابیں پڑھ کر جھومنا اور آنسو بہانا، ثبات عقل و ہوش کی حدود سے نکل کر عقل کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ کر نشے کے دائرے میں داخل ہونا ہے

فنون لطیفہ کے سلسلے میں جب فن کار تخلیق کے ہیجان میں آتا ہے تو اسے ہستی کا ہوش نہیں رہتا بلکہ وحی کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے ـــــ خدا میں ایک فنکار کی مانند جب تخلیقی ہیجان پیدا ہوا تو اس نے " کن فیکون " کا نعرہ لگایا کائنات خلق ہوئی تخلیق کائنات اسی شے کی رہین منت ہے جسے نشہ کہا جاتا ہے . . . . اس لئے اس نشے کی طرف جو ساغر و مینا کی وساطت سے پیدا ہوتا ہے انگلیاں اٹھانے کا ارتکاب کیوں ؟

جوش نے خمریات کے باب میں بڑی نادر اچھوتی اور بصیرت افروز نظمیں غزلیں اور رباعیاں لکھی ہیں جس میں شاعر نے اپنے عہد کی ساری کشمکش کو خوبصورت پیرائے میں سمیٹ لیا ہے جہاں فرسودہ روایات کے کائی لگے پتے جھڑ جاتے ہیں اور نئے یاقوتی پھول کھل اٹھتے ہیں۔

وقت سحر ہے، آؤ حریفو وضو کریں
مینا اٹھائیں خدمت جام و سبو کریں
لو کھل گیا وہ پرچم خورشید زرنگار
اٹھو کہ دادِ رحیۂ صد رنگ و بو کریں
آؤ بنائیں یار کو پھر صدرِ انجمن
آئینہ آفتاب کے پھر روبرو کریں
لیلائے کیف دوش کا مرجھا چلا ہے ہار
پھر تازہ پھول گوندھ کے زیبِ گلو کریں
آنے لگی ہے دیر سے ناقوس کی صدا
آؤ تصور صنم سادہ رو کریں
پھر دعا زمانہ اٹھائے ہوئے ہے ہاتھ
یارو۔ اٹھو۔ کہ بیعت دست سبو کریں

ہاں اس طرف بھی عابد شب زندہ وار دیکھ
ایماں دل نہ جائے صرف ایک بار دیکھ
مستوریوں میں لطف و عطا کا گزر نہیں
مستوں میں جوش رحمت پروردگار دیکھ
اک دائمہ ہے طنطنۂ شیخ مدرسہ
آمے کدے میں ولولۂ بادہ خوار دیکھ

یہ شوخ فضا، یہ تازہ چمن، یہ مست گھٹا، یہ سرد ہوا
کافر ہے اگر اس وقت بھی کوئی رخ نہ کرے میخانوں کا

حضرت جوش نے لالۂ و گل اور ساغر و مینا کے پردے میں جس طرح زندگی کی وسعت، مرکب، پیچیدگی اور متحرک صورت میں تہہ در تہہ نفسی کیفیات کو بیان کیا ہے وہ محض رومانی سرشاریت نہیں بلکہ ان کی بصارت۔ بصیرت پر گواہ ہیں۔

جو غم کو نہ دیکھے وہ نظر دے ساقی
انگور سے دل کے زخم بھر دے ساقی

قاتل ہے کوئی چیز تو احساس لطیف
اس تیغ کی باڑھ کند کر دے ساقی
غالب ہے مرا جذبۂ غیرت مجھ پر
اک قہر ہے ناکسوں کی صوحت مجھ پر
زاہد اگر آج مے کو جائز کر دے
اک قطرہ کبھی کبھی ہیوں تو لعنت مجھ پر

زیبا نہیں شیخ! زندگانی ایسی
اللہ سے اور بدگمانی ایسی
بے شاہد و بادہ جس کی راتیں گذریں
توہینِ مشیت ہے جوانی ایسی

یا

کیا شیخ ملے گا گل فشانی کر کے
کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

یا

کیا شیخ کی خشک زندگانی گذری
بے چارے کی اک شب نہ سہانی گذری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا
جنت کی دعاؤں میں جوانی گذری
ساقی تاخیر کا نہیں ہے یہ محل
مستوں کی طرح جھوم رہے ہیں بادل
دے جنتِ آبگینہ یعنی ۔ ساغر
لا کعبۂ سربہ مہر یعنی بوتل

کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے
کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

یہ لرزشِ صہبا، یہ ضیا باری ماہ
یہ زمزمہ، یہ عربدۂ چشم سیاہ
کل تک تو دنیا میں تھا اور اب دنیا
خود میری ہتھیلی پہ ہے: اللہ اللہ

جوش صاحب کے یہاں شراب۔ ساقی۔ میخانہ۔ محتسب۔ واعظ کا ذکر رباعی میں بار ہا ملتا ہے۔ روایتی انداز سے بھی اور پرانی ڈگر سے ہٹ کر بھی۔ خیام کی طرح خمریات کا تذکرہ شیوۂ تباں کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ لیکن انکی عقلیت پسندی اور انقلابی فکر شراب اور خمار کے پردے میں مذہبی ریاکاروں کا پردہ بھی چاک کرتی ہے اور شراب کی تر و تازگی سے فضا کو معطر بھی کرتی ہے۔

زیبا نہیں نہیں شیخ زندگانی ایسی
اللہ سے اور بدگمانی ایسی
بے شاہد و بادہ جس کی راتیں گذریں
توہینِ مشیت ہے، جوانی ایسی

مستی نے انگھڑیوں کے پیمانے میں
جسطرح کہ " رومان " ہوا فسانے میں
یا جیسے یکایک ہو نزولِ الہام
یوں صبح کو آیا کوئی مے خانے میں

ہاں بارِ خرد سر سے اتارو، بہکو
مینہ زور سے پڑ رہا ہے، یارو بہکو
برسو، برسو سیاہ گھٹاؤ، برسو!
بہکو بہکو شراب خوارو، بہکو

کس شان سے پڑ رہا ہے پیہم پانی
گردوں پہ اڑا رہا ہے پرچم پانی
ہاں مطرب، ہاں یونہی چھما چھم للہ
گلشن میں برس رہا ہے جھم جھم پانی

رندی میں نہیں کم نگاہی ساقی
فرقِ مومن و شانِ کم کلاہی ساقی
اللہ کا بندے سے تعلق ہے جہاں
واں گم ہیں اوامر و نواہی ساقی

پستی سے گذر، عرشِ معلیٰ ہو جا
پی اتنی کہ خود ہی روحِ صہبا ہو جا
ہاں بجھ کے چراغِ عقل، بن جا خورشید
ہاں ٹوٹ کے اے حباب، دریا ہو جا

ہوشیار کہ آفتاب ہونا ہے تجھے
پیغمبر انقلاب ہونا ہے تجھے
ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا
بیدار کہ خود شراب ہونا ہے تجھے

کیا فائدہ شیخ تجھ سے کہنے میں مجھے
خشکی میں تجھے لطف سننے میں مجھے
عیاش تو دونوں ہیں مگر فرق یہ ہے
کھانے میں تجھے مزا ہے، پینے میں مجھے

جی مے سے مرا بھر نہیں سکتا ساقی
مستی سے کبھی ڈر نہیں سکتا ساقی
جب تک ہے وجہہ ذوالجلال والاکرام
واللہ کہ میں مر نہیں سکتا ساقی

اب ہم سے بھی دنیا میں کہاں ہیں ساقی
آنکھیں تری جانب نگراں ہیں ساقی
ہم نہیں آرزو کے تجدید شراب
ہر جام میں سو جوانیاں ہیں ساقی

چھو گئی تاریک رات میرے دل میں — بدمست ہوئی حیات میرے دل میں
ساقی نے سبو دے کے اٹھایا جو رباب — گم ہو گئی کائنات میرے دل میں

کائنات گل بدن ہے۔ اس کی خوشبو اور رنگت نے ہمیشہ ذہن انسانی کو مسحور کیا۔ رنگ و بو میں زندگی کی تازگی، مستی اور لطافت پوشیدہ ہے۔ حضرت جوش کے کلام کی وادی میں نکہت و نور اور رنگ و بو کی فضا دور دور تک پھیلی ہوئی ہے جس میں سونا گھلی ہوئی صبح کی رنگت، روپہلی و سنہری کرنوں کی رنگت لہریا دھنک کی رنگت، بادلوں میں تیرگی کاٹتی ہوئی بجلی کی رنگت موجود ہے لیکن جس طرح ہجر مسلسل اور قرب مسلسل دونوں ہی قاطع محبت ہیں۔ اس طرح اگر ایک رنگ ابتدا سے انتہا تک ہو تو جی اوبھ جائے۔ حضرت جوش کے یہاں پیمانہ گردش میں آتے ہی رنگ بدلنے لگتا ہے۔ شدت احساس کے بڑھتے ہی رنگ کا نشہ بھی دو آتشہ ہو جاتا ہے پھر وہ کہیں بادو باراں میں جھولے ڈالتا ہے۔ کہیں گالوں پہ نرت کرتا ہے کہیں محبوب کی کانوں کی لوؤں میں جگمگاتا ہے کہیں دوشیزہ کی قرمزی رنگت میں ابھرتا ہے۔

جس طرح غالب نے نشۂ رنگ کی تراکیب سے کروڑوں حسن کے پھول کھلائے رنگ کی طلسماتی فضا کی تخلیق کی اور نشے کی کیفیت کو زندگی کی رو میں تبدیل کر دیا۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذر گاہ خیال — ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب
ایک عالم پہ ہے طوفانی کیفیت فصل — موجۂ سبزہ نوخیز سے تا موج شراب
ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد — پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

اس طرح حضرت جوش بھی رنگ کی تمام کیفیات کے آشنا ہیں۔ نشے کی شدت سے تخیل گل کاریاں کرتا ہے اور قرمزی افق سے ایک نئی دنیا اس طرح آباد کر دیتا ہے

ان کے ہر شعر سے مستی کا رنگ اس طرح ٹپکتا ہے۔

لو کھل گیا وہ پرچم خورشید زرنگار
اٹھو کہ وا دریچۂ صد رنگ و بو کریں
مستانہ وار جیب جوانی کے چاک میں
پھر رشتۂ شراب کہیں سے رفو کریں

گردوں قرابہ نوش تو گیتی ہے مے پرست
رنگینوں میں غرق ہے دنیائے بود و ہست
اوڑھے ہے اک حباب سی چادر بلند و پست
سبزہ غنودہ پھول نشہ سے ہوائیں مست
کہسار کی کمر ہے گھٹا سے کسی ہوئی
گل گوں فضا ہے خواب کی لستی بسی ہوئی

خیر سے باغ میں پھر غنچۂ گلرنگ کھلا
شکر ہے دور میں پھر ساغر سرشار آیا
جھوم اے تشنۂ گلبانگ نگارِ عشرت
کہ لب یار لئے چشمۂ گفتار آیا

ہر گام پہ جنبش میں ہے یہ زلف رسا
فوارے سے یا ابل رہی ہے صبا
یا موج خرام کا اشارہ پاکر
شانوں پہ امنڈ آئی ہے گھنگھور گھٹا

ہاں اٹھ کہ مہر شیشۂ گل رنگ توڑ کر
انسانیت کو دام خرد سے رہا کریں
برسات کی گھٹاؤں سے برسے گلا بیاں
اور ہم وضوئے شت شوئے دست و پا کریں

حضرت جوش رنگ و بو کے بیان سے ایک ذوق نو کی تشکیل کرتے ہیں کہ جس سے مضمحل لغموں میں بیداری، سکون میں تلاطم، بے نوائی میں ترنم کا احساس پیدا ہوتا ہے ان کے نشہ افروز ذوق میں اجنتا کی تصویروں کی خاموشی، قوس و قزح

کے کمان کا لوچ ، کھیتوں کی سنہائی کی گنگناہٹ ، مشینوں کی نقش ہائے رنگ رنگ کی آمیزش سب کچھ موجود ہے جو جمالیاتی مسرت میں اضافہ کرتی ہے۔

جمالیات" بسیار شیوہ ہا است تباں راکہ نام نیست " کے عنوان کی چیز ہے۔ افلاطون وارسطو سے لے کر سینٹ آگسٹائن اور ڈارون تک اس نے سینکڑوں پہلو بدلے۔ کسی نے حسنِ مطلق و مجرد کو احساسِ جمال کا نام دیا اور کہیں اضافی حسن کو جمالیات سمجھا گیا۔ یورپ میں نشاۃ الثانیہ سے پہلے یونانی تصورات کی حکمرانی تھی جس میں عیسائی نظریات کا بھی امتزاج ہوا تھا۔ جن کے تحت حسن کا منبع حسن حقیقی کو قرار دیا گیا تھا۔ صوفیوں کا 'جلوہ'، کا تصور اور ہندؤں کے یہاں درشن کی اہمیت پر اسی فکر کی چھاپ ہے۔ جہاں حسن کے ساتھ "خواہش کا میل ممکن نہیں تھا۔ یہ نظریہ جمال جمالیاتی ذوق اور جمالیات کو آسمانی الہامی اور وجدانی شئے سے تعبیر کرتا تھا جس سے زندگی کا براہِ راست کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس طرح آرٹ خدا کے چند پہنچے ہوئے بندوں کی میراث تھا۔ اور اس سے محظوظ ہونا بس انہیں کا کام تھا
______ اسپکورین فلسفی بھی حسن کے خارجی مظاہر سے کے سختی سے مخالف تھے مشہور اسپکور فلد ولیس نغمہ کو alona یعنی غیر منطقی کہا کرتا تھا جس کا اظہار اس کے نزدیک ممکن ہی نہیں اس لئے اس سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
یورپ میں نشاۃ الثانیہ نے جہاں زندگی کے اور تصورات میں تبدیلی آئی وہاں جمالیات کا تصور بھی بدلا۔ اسے آسمان سے اتار کر زمین پر لایا گیا۔ اس کا رشتہ مادے سے استوار ہوا لیکن سطحی۔ چنانچہ ڈارون جیسے محقق فلسفی اور سائنس دان نے جمالیات
Subjcct is very obscure سے بحث کرتے ہوئے
قرار دیا۔ اس کے بعد ہیگل کے تصورات جمالیات نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نے جمالیات کو تمام سماجی علوم سے جڑا ہوا دیکھا۔

ذوقِ جمال، اور جمالیاتی حسن دراصل نہ مطلق ہے اور نہ مجرد۔ اس کا تاریخی اور تہذیبی شکست و ریخت سے رشتہ جڑا ہوا ہے۔ جمالیاتی احساس جغرافیہ، تاریخ ماحول سب کا پابند ہوتا ہے۔ دھنک کو دیکھ کر میر کا شعر پڑھنا " اور کم کم باد و باراں " سے لطف اندوز ہونا لندن میں ممکن نہیں وہاں برسات نہیں سورج کی کرنیں لطف و تسکین اور لذت کی فراوانی کا سبب اور نشاط انگیز مناظر کی دلکشی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

حضرت جوش کا ذوقِ جمال ان کے ماحول اور زندگی کے حسن سے بندھا ہوا ہے۔ ان کا احساسِ جمال افلاطونی عینیت پرستی کا مارا ہوا نہیں بلکہ طبقاتی سماج کی پیچیدگیوں میں گندھا ہوا ہے۔ وہ مستقل، ابدی اور غیر تغیر پذیر قدروں کے قائل نہیں۔ ایسے معاشرے میں جہاں انسانی جسموں کو گنے کی رس نکالنے کی مشین میں ڈال کر نچوڑا جا رہا ہو۔ چاروں طرف غلاظتیں، سیاہیاں، کوڑے کرکٹ کی گاڑیاں، بہتے ہوئے آنسو، پچکے ہوئے گال، گدلا پانی، رینگتے بدن، افسردہ آرزوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوں۔ وہاں تقدس مآب اخلاق کی گلکاریاں کرنا، توہین آدمیت ہے۔ کیونکہ اخلاقی قوانین اوپر سے تھوپے نہیں جاتے بلکہ زندگی میں حسن پیدا کرنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ زندگی کی معاشی و سیاسی بنیادوں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ان اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے اندر رہنا انسان کے لئے ناگزیر ہو جائے۔ شراب پر انگلیاں اٹھانے کا ارتکاب کیوں؟ ــــ حضرت جوش نے اسی حسن و قبح کے پہلوؤں کا جائزہ انتہائی لطیف انداز میں لیا ہے جس سے سماجی حقیقت نگاری کا رنگ یوں جھلک اٹھتا ہے۔

معاشرانِ طرب خانۂ ادب ہشیار — کہ آسمان نے پھر مشقِ ظلم جاری کی
بساط اٹھاؤ کھی اے ماہران شیشہ گری — کہ پھر گرج ہے گھٹاؤں میں سنگ باری کی
سنبھل کے سانس لو اے بیکسانِ صبحِ نشاط — کہ لو ہواؤں میں ہے شامِ سوگواری کی
بچاؤ موت سے لیلائے خام کاری کو
کہ پڑ رہی ہے بنا ذوق پختہ کاری کی

محراب قہقہاں میں بااِیں سوز و گداز — اے جوشؔ بجا رہے ہو کیوں فکر کا ساز
بیٹھی ہوئی آنکھوں میں نہ ٹھونسو انوار — پھوٹے ہوئے کانوں میں نہ ٹھونسو آواز

جوشؔ کی رندشربی سے ایک طرف اردو شاعری کو جمالیاتی حسن، کیف و مستی کی ترنگ ملی تو دوسری جانب وہ سماجی حقیقت نگاری سے آشنا ہوئی۔ "پندنامہ مجاز" ان کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ جس میں دردمندی، تخلیقی فکر کی گلکاریاں شادمانی سے محتاط اور مستی میں ہوشیاری کی تلقین ہے۔ یہ ایک ایسا دستور العمل ہے جس کے پس منظر میں سماج کی بدصورتی اور بدبختی جذبہ رندی کو یک رخا نہیں بلکہ زندگی کے تمام رشتوں سے جوڑ دیتا ہے۔

غم کے مارے تو جی رہے ہیں ہزار — نہیں بچتے ہیں عیش سے بیمار
آن میں دل کے پار ہوتی ہے — پنکھڑی میں وہ دھار ہوتی ہے
ہاں سنبھل کر لطافتوں کو برت — ٹوٹ جائے نہ دیکھ کوئی پرت
دیکھ کر شیشۂ نشاط اٹھا — یہ ورق ہے ورق ہے سونے کا
تیغ مستی کو احتیاط سے چھو — ورنہ ٹپکے گا انگلیوں سے لہو
خوب ہے ایک جذبۂ قائم نشہ — ہلکا پھلکا سبک ملائم نشہ

جوشؔ صاحب کا تخیل پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ ان کے یہاں مشاہدے کی وسعت تجربے کی گہرائی، تفکر کا رچاؤ صوتی تزئین و ترتیب سب کا حسین امتزاج ہے۔ علامات کے ذریعے وہ ایک ایسی دنیا تخلیق کرتے ہیں جہاں پرانے جام ٹوٹ چکے ہیں۔ عوام کے خون کے نیلام پر پابندی لگ چکی ہے۔ نئے جام اور نئی شراب چھلکنے کو ہے اور تازہ شریعت کا نفاذ ہو رہا ہے۔ عصر حاضر کی صداقت فنی پیکر میں یوں جلوہ گر ہے۔

اٹھ کہ خورشیدِ کہن ہے لب بام اے ساقی　　جلد اٹھا عصرِ جواں سال کا جام اے ساقی
جس کی سُرخی میں تھی آمیزشِ خونِ انساں　　آج اس صبح کی ہونے کو ہے شام اے ساقی
حُوریانِ ارمِ کُہنہ کے اس دُنیا میں　　اب اُکھڑتے نظر آتے ہیں خیام اے ساقی
ہوگا اِک تازہ شریعت کا زمانے میں نفاذ　　اب رہے گا یہ حلال اور نہ حرام اے ساقی
قصرِ اجسام سے اجرامِ فلک کی جانب　　چند ہی روز میں جائیں گے پیام اے ساقی

یہ ہلال آج جو دُھندلا سا نظر آتا ہے
اِس کو ہونا ہے اُبھی ماہ تمام اے ساقی

(ساقی)

خمریات کا موضوع جوشؔ کے یہاں بڑے پھیلاؤ اور رچاؤ کے ساتھ آتا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا "چند جرعے" ان کے تجربات اور ذہنی کیفیات کی ترجمان ہیں۔ "بادہ و ساغر" کے پردے میں "ریا کاری" پر سے یوں پردے اٹھائے ہیں۔

تعالیٰ اللہ شانِ بادہ خواری　　نئی ہلچل، نرالی بے قراری
کوئی کروٹ سی دل میں لے رہا ہے　　لہو میں کشتیاں سی کھے رہا ہے

نئی شکلیں ہیں سینے پر منقش　　مبارک امتزاجِ آب و آتش
سخن کی داد خود سے پا رہا ہوں　　کلی کی طرح کھلتا جا رہا ہوں
اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

(جرعہ اوّل)

رگ و پے میں ہے غلطاں تو جوانی　　ہر اک لمحہ ہے عمرِ جاودانی
مری مٹھی میں ہے روحِ مہ و سال　　تپاں ہے ماضی و مستقبل و حال
ترانے وقت سے آزاد ہو کر　　ہوئے ہیں ساز کے پردوں سے باہر
سبو کی آگ سے دہکے ہوئے ہیں　　فضا میں پھول سے مہکے ہوئے ہیں
یہ کیسی طرفگی ہے آج ساقی؟　　صراحی میں ہے نورِ دجر باقی
اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

(جرعہ دوم)

تعالیٰ اللہ شانِ مئے پرستی　　گھٹا سی ہے گرجتی اور برستی
ندی ساون کی چڑھتی آ رہی ہے　　سوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے
فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں!　　بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں
ہر اک ذرہ کھِلا جاتا ہے گویا　　گلے آ کر ملا جاتا ہے گویا
بڑھا جاتا ہوں، دریا ہو کہ وادی　　مبارک دولتِ خود اعتمادی
شریعت پر تباہی آ رہی ہے　　مشیت کو جماہی آ رہی ہے
اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری — ستاروں پر ہے میرا حکم جاری
ابد کا نور رقصاں ہے جبیں پر — خلا ہے وقت کے سینے کے اندر
ہر اک لمحہ ترانے گا رہا ہے — زمانہ یوں کمر لچکا رہا ہے
چمکتی ہیں بتوں کی بالیاں سی — فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی
جوانی روح میں اٹھلا رہی ہے — نظر پر کا کلیں بکھرا رہی ہے

اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہد ریائی

(جرعہ چہارم)

تعالیٰ اللہ شکست خود نمائی — بھرا ہے خاک میں زورِ خدائی
فلک پر نشہ سا چھایا ہوا ہے — زمیں کو حال سا آیا ہوا ہے
ہتھیلی پر لئے ہوں گلستاں کو — کہاں کا گلستاں، سارے جہاں کو
شریعت سے کنارا ہو چکا ہے — مشیت کا اشارا ہو چکا ہے
جبینِ "حال" پر ہے نقش "ماضی" — کوئی حد بھی ہے ان بدمستیوں کی
ہوائے تاک و برگِ یاسمن مست — بُتِ نو خیز و صہبائے کہن مست

(جرعہ پنجم)

جوشؔ کی خمریات کی شاعری میں دو پہلو نمایاں ہیں۔ ایک وہ جس میں زندگی کی حقیقتوں کو شاعرانہ انداز میں سوچنے کا رویہ ہے۔ دوسرا مفکرانہ انداز ہے شاعرانہ انداز میں جب بات کہی جاتی ہے تو "بادہ و ساغر" کا استعارہ بنیادی اہمیت اختیار کرلیتا ہے۔ لیکن انداز بیان کی شوخی اور "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کا تیکھا انداز اور طنز کے لطیف اور شگفتہ پہلو انتہائی قرینے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض ناقدین یہ غلطی کر جاتے ہیں کہ جوشؔ کی شوخی ہی کو ان کا مطمحِ نظر قرار دیتے ہیں حالانکہ

ایسا نہیں ہے۔ اس نہج کی شاعری کی تہوں میں بھی عقل کی آنکھ اپنی تمام عذابِ شب بیداریوں کے ساتھ جس طرح کھلی نظر آتی ہے۔ اس حد تک بھی نہیں کہ جیسے غالب نے کہا تھا۔ وہ ان کے عہد کی پوری شاعری میں نظر نہیں آتی۔

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے: ع

جوشؔ تو تصورِ جاناں کا نظارا بھی کھلی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ رندی و سرمستی کی چاشنی ہو یا "الہام و افکار" کا بیان انقلاب کی دھمک، ہو عشق کی سرمستی "جوشؔ کی ساری شاعری کا سفر بیدار نگہی کا سفر ہے۔ جس میں عقل کی آنکھ وا رہتی ہے وہ نما ہے۔ بدلتی ہوئی ہواؤں کا مطالعہ وہ اس طرح کرتے ہیں

شبِ آغوشِ چمن میں صبحِ خنداں تھی جہاں میں تھا
ہوائے سرد، موجِ آبِ حیواں تھی، جہاں میں تھا
زمیں کے چہرۂ رنگیں سے ایسی لو نکلتی ہے
فلک کی شمع رہنِ طاقِ نسیاں تھی جہاں میں تھا
چمن کے صحنِ رنگیں پر حقائق یوں برستے تھے
لبِ ہر برگ پر تفسیرِ قرآں تھی جہاں میں تھا

سحر تک شمعِ کافوری کے غم رفتار اشکوں میں
تبسم ریز روحِ شبنمستاں تھی، جہاں میں تھا
فرازِ ذہن کے رومان پرور ابر پاروں میں
نظر افروز برقِ روئے تاباں تھی، جہاں میں تھا
چمن کے سرد و آوارہ خس و خاشاک کے اندر
جہندہ نبضِ رعد و برق و باراں تھی، جہاں میں تھا

حقائق کے مُعطر جامع اضداد بستر پر
بہم خوابیدہ روح کفر و ایماں تھی، جہاں میں تھا
ستارے نقش بر دیوار تھے، مہتاب سکتے میں
مشیت گوش بر آواز زنداں تھی، جہاں میں تھا
کبھی چہرے دمکتے تھے، کبھی زلفیں بکھرتی تھیں
حقیقت نیم پیدا نیم پنہاں تھی، جہاں میں تھا
کسی چشم سیہ کے بزم آرا مست پرتو سے
ہر اک ذرے میں اک شبستاں تھی، جہاں میں تھا
قدیم آب جو میدان کے دھندلے کناروں پر
محبت کا کلین کھوئے خراماں تھی، جہاں میں تھا
ملائک ہی نہ تھے سجدے میں پیش آدم خاکی
الوہیت بھی زیر دام انساں تھی، جہاں میں تھا

(جہاں میں تھا)

جد و جہد آزادی اور تکمیل انقلاب میں قوم کی پوری شخصیت اجتماعی طور پر کام کرتی ہے جس کے کروڑوں پہلو ہوتے ہیں اور ہر پہلو میں خواہ حسن و عشق ہو یا مے گساری و رند مشربی ابدی تازگی ہوتی ہے لیکن اس تازگی، شگفتگی اور رعنائی کو چھیننے میں بالائی طبقہ پیش پیش رہتا ہے تاکہ حسن و رعنائی عام انسان کا حصہ نہ بن سکیں۔ مے پرستی پر قدغن اس کا بین ثبوت ہے۔ انساں کا لہو تو پیو اذنِ عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے۔

جوش نے شاعری کے تانے بانے پر سفید اور سیاہ دھاگے دونوں لگائے لیکن اس طرح کہ دونوں خلط ملط نہیں ہوتے جو ان کی عقلی پختگی اور انقلابی فکر پر دلالت کرتی ہے۔

عقل و جنوں

موضوعات کا انتخاب اس کی ہمہ جہت اور ست رنگی نظر فنکار کی فکر کو خانوں میں تقسیم نہیں کرتی۔ اعضا مختلف ہیں خون کا رنگ ایک ہے۔ آنکھیں دو ہیں نور ایک ہے، دھنک میں کئی رنگ ہیں باطنی کیفیت ایک ہے۔ شاعر شعور کے بل پر مشاہدے کی گہرائی، تخیل کی پرواز اور تجربات کو سمیٹ کر فن میں رنگینی اور زندگی میں رعنائی پیدا کرتا ہے۔ یہ سب کرشمہ شعور کی پختگی کا ہے جس میں حضرت جوش کا کوئی ہمسر نہیں۔

حضرت جوش سے قبل علامہ اقبال کے اقبال کا آفتاب سوا نیزے پر تھا۔ اس آفتاب کی جگمگاہٹ کے بعد جوش کا چراغ جلنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن جوش "نیا آفتاب" پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی تابناک فکر ادب کا زریں تاج بن گئی۔ اس پہلو کے چند بنیادی وجوہ ہیں۔

اردو ادب میں اقبال ہمالہ صفت ہیں کہیں چوٹیاں تابناک ہیں اور کہیں برف کی سلوں میں دبی کہیں راستہ طے کرنا بہت آسان، کہیں ایسی ڈھلوان کہ اگر پیر پھسل جائے تو ہڈی پسلی کا پتہ نہ چلے۔ ان کی شخصیت متضاد کیفیات کی حامل ہے۔ جس کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل ز حریم حجاز و نواز شیراز است

برہمن زادۂ رمز آشنائے روم تبریز است

اقبال کے خمیر میں کشمیر کی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی ہے لیکن بد قسمتی سے وہ اس مٹی سے رشتہ استوار نہ کر سکے۔ گو برہمن زادے تھے لیکن اسلام کے شیدائی تھے۔ دل حریم حجاز سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن بجائے حجاز جانے اور اس در پہ سجدہ ریز ہونے کے تلخی فکر دور کرنے کے لئے یورپ کا سفر کیا تھا۔ ان کا اس بات پہ ایمان تھا کہ "تمام بنی نوع انسان آپس میں ایک ہیں کیونکہ حیات انسانی کی جڑ ایک ہے۔

(روزگار فقیر جلد دوم ص۱۸۰)

انسانوں سے اسی گہری دلچسپی کا جذبہ وطن کی محبت کا محرک تھا ــــ "ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت کرتا ہے اور بقدر بساط اس کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔"

(معرکۂ دین وطن ص۱۴)

اسی والہانہ جذبے کے تحت "نیا شوالہ"، "تصویر درد" اور "ترانہ ہندی" جیسی لازوال نظمیں لکھیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

یورپ کے سفر نے ان کی فکر میں انقلاب پیدا کیا۔ فرنگیوں کی کھوکھلی تہذیب، وطنیت ونسل پرستی کا طوفان، "جمہوری نظام کی نیلم پری کے" پردے میں ستم گری اور مسلمانوں کی زبوں حالی نے ان کے ذہن پر ہتھوڑے برسائے۔ مسلمانوں کے ساتھ اپنی فکر کو استوار کیا۔ ماضی کے اسلام کی شان وشوکت کے ذریعے مسلمانوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے کوشاں ہو گئے، لیکن پھر وطنیت، کا نظریہ پرانا ہو گیا۔ قومیت

کا تصور دوسرے عنوان سے نظر آنے لگا۔ " وطنیت " کے قومی تصور میں اس طرح انقلاب آیا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

اس نظریہ کا جواب اکبر الہ آبادی نے اس طرح دیا

کچھ بھی نہیں ہمارا، وہم و گماں ہمارا

ڈاکٹر نکلسن کے نام خط میں یہ الفاظ تحریر کیے " انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔"

(مضامین اقبال۔ حیدرآباد صد ۰۷)

کچھ عرصے بعد اسی عقیدے کی حمایت میں " دو قومی نظریے " کی تائید فرمائی اور اس کے سب سے بڑے مبلغ بن گئے۔

اقبال نے منظم و مربوط فکر کے نتیجے میں سامراجیت اور ملوکیت کا سماجی تجزیہ کیا۔ محکوم اقوام میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لئے سامراجیت کی بین الاقوامی سازشوں کے جال کی پردہ دری کی۔ " پیام مشرق میں " نقش فرنگ " علیحدہ باب ہے۔ جس میں انہوں نے سامراجی اور سرمایہ داری نظام پر وار کئے ہیں۔

رہزنی را کہ بنا کرد جہاں بانی گفت
ستم خواجگی او کمر بندہ شکست
بے حجابانہ بہ بانگ دف، مے می رقصد
جامے از خونِ عزیزاں تنک مایہ بدست

من دریں خاک کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

اور ۱۹۱۷ء کے روس کے انقلاب کے بعد جس نے محنت کا تاج انسانیت کے ماتھے پر رکھ دیا۔ اقبال اس سے غیر معمولی حد تک متاثر ہوئے۔ زمانے کو "آفتاب تازہ" کی بشارت دی۔ اور سرمایہ و محنت کا سماجی تجزیہ اس طرح کیا۔

اور یہ سرمایہ محنت میں ہے کیسا تضاد
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

" نوائے مزدور" لینن خدا کے حضور" "کارل مارکس کی آواز" "فرمان خدا فرشتوں کے نام" جسے خلیفہ عبدالحکیم نے " کمونسٹ مینی فسٹو " کا نام دیا۔ ان نظموں میں اقبال نے اشتراکیت کا خیر مقدم کیا۔ " اقبال اشتراکیت کے اس پہلو کے مداح ہیں۔ سلطنت ، اور کلیسا کے متعلق قدیم عقائد کے خلاف احتجاج کیا اور جہاد کیا۔ یہ اقدام روحانی ترقی کا امکان پیدا کرنے کے لئے لازم تھا۔

فکر اقبال صہ ۲۴۷

پنڈت نہرو نے "Discovery of India" میں یہ لکھا

"During his last years Iqbal turned more and more towards Socialism even his poetry took a different turn,, p 305

لیکن اقبال اشتراکیت کو من وعن تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ فکر کا تضاد پھر اس طرح ابھر آیا۔

"اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایشیا کے تمام مسلمان روسی کمونزم کی آغوش میں چلے جائیں.......اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر لیا جائے تو وہ اسلام کے قریب آجائے گا....."

اقبال اور سیاست ملی ص ۲۴۶

اشتراکیت میں روحانی اقدار کی کمی کی بنا پر وہ اشتراکی معاشی نظام کے بھی حق میں نہیں رہے۔ لینن کو بھٹکا ہوا انسان کہہ دیا۔ اور مارکس کے متعلق فرمایا۔

تری کتابوں میں اے کلیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مزید کجدار کی نمائش

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار۔ آشفتہ مغز آشفتہ ہو
(خطبۂ صدارت مجلس شوریٰ ضرب کلیم)

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں آجائے
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

وہ اپنے اس نظریہ "خوشۂ گندم کو جلا دو" کی نفی اس طرح کرتے ہیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

"زمین کی ملکیت خداوندی" کے تحت اللہ کی زمین کہہ کر تمام بندوں بادشاہ اور فقیر دونوں کے حق میں فتویٰ صادر کر دیا۔ دونوں کو کھلی چھوٹ دیدی
وَیسْئَلُوْنَکَ ماذا یُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ،
اقبال کے نزدیک نظام معیشت میں اس کی حیثیت کلیدی ہے۔

جو حرفِ قُلِ العَفْو میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

مزدوروں اور کسانوں کی محنت سے قائم شدہ نظام حیات اور ان کی حکمرانی کی تعریف کرتے کرتے اس کی اس طرح تردید کر دی

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اشتراکیت میں روحانی اقدار کی کمی نے اقبال کو اشتراکی فلسفہ حیات سے بددل کر دیا۔ کیونکہ وہ نظام روحانیت و جدانیت دونوں ہی سے پاک ہے۔ چنانچہ اسلام کی روحانی اقدار کی تلاش میں نٹشے کے فلسفے نے انھیں موہ لیا۔ نٹشے کے یہاں دو باتیں اہم ہیں۔ اول یہ کہ وہ جنگ کو فطری عمل قرار دیتا ہے۔ جو کمزور کو نیست و نابود کرے گا اور قوی کو قوی تر ہٹلر اور بسمارک کا، ملکٹ، اسی کا مرہون منت ہے۔ دوسرے super man کا تصور بھی اسی نے دیا۔ یہ انسان خیر و شر سے بلند ہو گا۔ نٹشے بنیادی طور پر صرف

اشتراکیت ہی نہیں بلکہ جمہوری نظام کا بھی مخالف تھا۔ نٹشے بھر انسانوں کے لئے وہ جمہوریت کو بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار تھا۔

اقبال اسلامی نظریہ کے حامی اور علمبردار ہوتے ہوئے نٹشے کو "مومن کا دل" رکھنے والا گردانتے ہیں۔ چنانچہ اسی فکر سے متاثر ہوکر یہ نظریہ حیات پیش کیا۔

کہ " خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔"

اقبال کے فلسفے خودی میں super man بنیادی پتھر ہے۔ یہ فوق البشر خودی کے نٹشے سے چور ہے۔ تاریخ انسانیت میں اقبال کے نزدیک اہم کارنامے فوق البشر کے ہاتھوں ہی انجام پائے ہیں۔ مسولینی کی فکر کو انہوں نے اس طرح خراج پیش کیا۔ کیونکہ وہ ان کے نزدیک "نجات دہندہ" تھا۔

فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی   وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاع آفتاب

"شاہین" جو اقبال کی شاعری میں بطور علامت کے استعمال ہوا ہے۔ وہ نپولین، مسولینی اور ابدالی ہی کے روپ کو مثالی بناکر پیش کیا گیا ہے۔

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

آج اقبال کا یہی وہ شاہین ہے جو ایشیا سے نکل کر "لہو گرم رکھنے کے بہانے" فلسطین کی سرزمین پر آفتاب نو کو بجھا رہا ہے۔ اسلامی حکومت کی قبا کو پارہ پارہ کر رہا ہے۔ یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا اقبال کا فوق البشر کا تصور غیر اسلامی تو نہیں ہے؟

اسلام امن و شانتی کا مذہب ہے۔ صلح حدیبیہ اس کی صلح جوئی کا نشان ہے۔
جہاں رسول کریم نے انسانیت کی خاطر اپنے دست مبارک سے رسول کا لفظ کاٹ دیا تاکہ زرگرم
و جہل کی جگہ امن و شانتی کی قوتیں مضبوط ہوں اور کمزور انسان شمع شبستاں بن جائے لیو۔
اسلام میں "شاہین کو [illegible] کرنا گناہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اسلام اقبال کی فکر میں بنیادی پتھر ہے جس کے تانے بانے میں انہوں نے اپنے
فلسفہ خودی کے نظریئے کو بنا۔ زندگی کا محور خودی ہے۔ اس خودی سے کائنات سرشار ہے۔
یہ سکون ناآشنا اور تغیر افروز ہے۔ اگر یہ خودی انسان کو حاصل ہو جائے تو پھر وہ
انسان کو اس منزل پہ پہنچا دیتی ہے۔"

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اس خودی کی تکمیل تین منزلوں سے گذر کر انسان کرتا ہے۔ اطاعت، ضبط نفس اور
نیابت الہی اگر یہ منزلیں انسان طے کر لے تو وہ خدا کے عمل تخلیق میں ایک نائب کی
طرح شریک ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں نے خودی کھو دی اس لئے حقیر و فقیر ہو گئے اگر
یہ خودی دوبارہ حاصل ہو جائے تو وہ محکوم قوم سامراجیت کے مقابلے میں کامیاب اور
کامران ہو جائے گی۔ یہی خودی تکمیل کی منزل پہ پہنچ کر فوق البشر کا روپ دھار لیتی ہے
جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

لیکن اقبال کے اس فلسفے میں کوئی اشارہ اس قسم کا نہیں ملتا کہ دنیا
میں صرف ایک مرد کامل اور فوق البشر ہوگا یا کئی؟ دوسری بات یہ کہ یہ مرد کامل
خلاؤں میں "بسیرا" ڈھونڈتا رہے گا یا زمین سے بھی اس کا رشتہ جڑا ہوگا؟ تیسرے
یہ کہ اگر اس فوق البشر کے قدم زمین پہ ہوں گے اور طبقاتی سماج میں وہ سانس لے رہا
ہوگا جہاں تین طرف اندھیرا اور ایک طرف اجالا ہوتا ہے۔ تو یہ مرد کامل کن قوتوں کے
ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اسلام کا پرچم لہرائے گا اور 'خدائی' حکومت قائم کرے گا؟

چوتھا کیا یہ مرد کامل طبقاتی کشمکش کو نظر انداز کر کے مصلحت جوئی سے کام لے گا اور موقع ملتے ہی الا العصر بن کر مسند نشین ہو جائے گا ؟ نیابت الٰہی صرف ایک مرد کامل کا حق ہو گا یا زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کا ؟

اسلامی نقطۂ نگاہ سے تمام "انسان برابر" ہیں۔ چنانچہ فوق البشر کا یہ تصور اسلام کے عقیدے کی نفی ہے۔ انہوں نے اپنے لیکچروں میں فرد کی اندرونی کیفیت کو یقیناً اجاگر کیا ہے۔ اجتہاد کی جانب توجہ دلائی ہے۔ لیکن سماجی کشمکش سے منہ موڑ کر کیونکہ طبقاتی سماج کو بدلے بغیر فرد صرف "خودی" کے ذریعے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار کیونکر لا سکتا ہے۔

قرآن علم کا منبع ہے۔ ۷۵۰ آیات ایسی ہیں جن میں تفکر و تعقل کی دعوت دی گئی ہے اور اس طرح عقل کی برتری کو تسلیم کیا گیا ہے۔ عشق و وجدان کا وہاں کوئی تذکرہ نہیں۔ لیکن مفکر اسلام اقبال شعور کے مقابلے میں وجدان اور عشق کی برتری کے قائل ہیں۔ وجدان ہر قدم پر ان کا رفیق ہے جس کے ذریعے وہ اشیا کے حقائق کی "نگہہ" حاصل کرتے ہیں ——— پیام مشرق میں ارشاد ہوتا ہے۔

"پہلے اندرونی انقلاب ہونا چاہیے کیونکہ روح کا انقلاب مادی زندگی میں انقلاب لاتا ہے۔" اس طرح قوموں کے نظریئے سے بحث کرتے ہوئے لکھا۔

"اس کے اسباب و علل عقل کی گرفت سے باہر ہیں . . . .

یہ ایک سرِ حیات ہے اور عقدۂ لاینحل "

(فکر اقبال خلیفہ عبدالحکیم ص۱۸۵)

ہر شخص جانتا ہے کہ قوموں کی تاریخ سماجی و اقتصادی رشتوں میں گندھی ہوئی ہے معاشی رشتوں کے بدل جانے سے قوموں کی تاریخ نیا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں کوئی "سرِ اسرار عل" نہیں وہ سائنسی حقیقت کی عکاس ہیں۔ سائنسی حقائق سماجی حالات اور عقل کی روشنی میں طے پاتے ہیں یا "اندرونی" کیفیات اور عشق و وجدان کے ذریعے۔ اس لئے قرآن میں تکرار کے ساتھ تفکر و تعقل پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن اقبال ابدی نظریہ حیات کے مبلغ ہوتے ہوئے عشق کی ایک جست سے انسان کو تمام ترقی کے مراحل طے کرا دیتے ہیں۔

عشق سراپا حضور ——— عقل سراپا حجاب
عشق تمام مصطفیٰ ——— عقل تمام بولہب

اس فکر کے ذریعے مفکر اسلام یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسلامی نظریہ حیات کی نفی فرما رہے ہوں۔ اقبال کا یہ تضاد وجدان کو فکر کی اساس بنانے کی بنا پر ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنی شاعری میں خلوص، فنی پختگی اور ایک اعلیٰ نصب العین کے ارد گرد ایک خوبصورت دنیا کی تشکیل کرتے ہیں لیکن جب ان کا فلسفہ حقائق کی سنگین چٹانوں سے ٹکراتا ہے تو ان افراد کے ہاتھوں میں ہتھیار بن جاتا ہے جو انسانوں کو بکاؤ مال سمجھ کر جنگ کی بھٹی میں جھونک دینا چاہتے ہیں۔

شعور و وجدان کی بحث بہت پرانی ہے۔ اس بحث کے اسباب و علل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کے پس منظر میں دو نظریہ حیات کی کارفرمائی نظر آتی ہے ———

یعنی یہ کہ اس آئینۂ آگہی میں تمام ہنگاموں کا محور انسان ہے ۔ وہی مقتدرِ اعلیٰ ہے ۔ اور یہ عقیدہ اسی کی ذات سے صادر ہوتا ہے ۔ اسی " نامعلوم جذبے " کے تحت انسان نے ابتدائے آفرنیش ہی سے ارادے کی صداقت اور نیت کی پاکیزگی کے ساتھ کوشش کی تاکہ سماج گل پیرہن ، ، احساسِ گلاب ، خس و خاشاک ماہ پیکر اور محبت فاتح عالم ، ہو جائے ـــــ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا ؟ ـــــ اور ایسا کیونکر ہو سکتا ہے ؟ تمام انسانی اعمال و افکار اور سماجی تغیرات اسی کی تفسیر ہیں ۔ ـــــــــــ

یہ سوال فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے جڑا ہوا ہے ، یعنی مادے اور شعور کے تعلق سے یعنی کیا حقیقت جامد و مطلق ہے ؟ ـــــ کیا خارج سے رشتہ کاٹ کر محض داخلی عمل کے ذریعے سماجی حقائق تبدیل ہو سکتے ہیں ؟ ـــــــ یا حقیقت متحرک ہے ؟ اور مادی حقائق کی تبدیلی سے شعور و ادراک کے زاویئے ، فکر و عمل کے پیمانے ، اور سماج کی ہمہ جہت نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے ـــــ کیا اثبات و نفی دو ایسی جدلیاتی قوتیں ہیں جن کے باہم تصادم سے نئی زندگی جنم لیتی ہے ؟ اور کیا سماجی قوانین کی تبدیلی کا ادراک انسان کو مقتدرِ اعلیٰ اور راکبِ تقدیر بنا سکتا ہے ؟ اٹھارویں صدی میں دو مکاتبِ فکر دنیا کی توجہ کا مرکز بنے ۔ (اول) فلسفۂ عینیت ـــــــ (دوئم) فلسفۂ مادیت ۔ عینیت پسندوں کے مطابق (۱) روح مادے کی تخلیق کرتی ہے ـــــ (۲) مادہ ہمارے خیالات سے باہر وجود نہیں رکھتا ـــــ (۳) ہمارے خیالات اشیاء کی تخلیق کرتے ہیں ـــــــ

اس فلسفہ کا بانی یونان کا عظیم مفکر افلاطون تھا ـــــ جس نے فطرت اور معاشرے کا مطالعہ مابعد الطبیعاتی ہنیج سے کیا ۔ اور یونان کے دو سو سالہ مادی فلسفۂ حیات کی بساط الٹ کر اقتدارِ مطلق ، کا تصور دیا ۔ مشہور فلسفی برکلے نے " ہیلاس و فلیوس کے مابین تین مکالمے " میں یہ نظریہ دیا کہ " دنیا ہمارے وجود سے باہر نہیں ہے ۔

مذہبی پیغمبروں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ " دنیا نور سے پیدا ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مادیت سے اس کا سروکار نہیں ۔ ۔ ۔ جسم و روح علیحدہ علیحدہ ہیں ۔ جسم خاک میں ملنے اور

روح آسمان پر رہنے کے لئے ہے .... اس لئے آسودگی، جسم و جاں کی تلاش ہیچ ہے ـــــ "لوح محفوظ" پر تقدیر رقم ہو چکی اور اسے مٹانا ممکن نہیں ۔ ـــــ

ـــــ ایک اور فلسفہ لا ادریت ، کا بھی وجود میں آیا ۔ 'لا' کے معنی نفی اور 'ادریت' کے معنی جاننا ـــــ یعنی جسے جانا نہ جا سکے ۔ اس فلسفے کا بانی ممتاز مفکر کانٹ تھا ـــــ یہ فلسفہ مادیت کو قبول بھی کرتا ہے اور رد بھی ـــــ یہ فلسفہ دراصل فلسفہ عینیت ہی کی بازگشت ہے ـــــ یہ ان لوگوں کو موزوں بنیاد فراہم کرتا ہے جو سائنسی رویے اور مادیت کے منکر ہیں اور دلائل کو اختتام تک پہنچانے سے خائف ہیں ۔ ـــــ مشہور مفکر اینگلز نے 'خیالی سوشلزم' میں اس فلسفے کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ "لا ادریت ، مادے کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کرتا ہے کہ کائنات سے بالا تر ایک ہستی ہے جس کی بنا پر نہ تو ہم تائید کر سکتے ہیں اور نہ ہی تردید"

فلسفیوں کا دوسرا گروہ خیال پر مادے کو فوقیت دیتا ہے ـــــ اس فلسفے کی رو سے حقیقت اپنا وجود رکھتی ہے ۔ اور یہ حقیقت ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہے بلکہ مربوط ہے کائنات جامد نہیں بلکہ متحرک ہے ۔ اثبات و نفی دو ایسی جدلیاتی قوتیں ہیں جن کے پیہم تکرار و تصادم سے نئی زندگی جنم لیتی ہے ۔ اور نیا معاشرہ وجود میں آتا ہے ۔ یہ فلسفہ مادے کو شعور پر فوقیت دیتا ہے ۔ مادہ شعور کی تعبیر کرتا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعور مادے پر اثر انداز نہیں ہوتا ـــــ اس فلسفے کا بانی عظیم مفکر کارل مارکس تھا جس نے اس عمل کو جدلی مادیت کا نام دیا جس کا اطلاق کائنات اور انسانی سماج دونوں پر ہوتا ہے ۔

اس فلسفے کی رو سے دو قلعوں کو فتح کرنا ضروری ہے (۱) مادی (۲) نظریاتی مادی قلعے کو فتح کرنے کا مطلب ذرائع پیداوار کی واحد اشتراکی ملکیت قائم کرنا اور اعلیٰ سطح کی پیداواری قوتوں کو جنم دینا ہے ۔ دوسرا نظریاتی ۔ جس کا مطلب محنت کش طبقے کو اس نظریہ حیات سے لیس کرنا ہے ـــــ مارکس نے بتایا کہ ,, فلسفیوں نے ابھی تک دنیا کی توجیہ کی ہے لیکن

اصل کام اسے بدلنا ہے۔" "تقدیر امم" بدلنے کے لئے اس نے مادی حالات میں انقلاب لانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اور یہ بتایا کہ انسان کی بنیادی لڑائی روزی، روٹی اور روزگار کی ہے۔ محنت کش انقلاب کا ہراول طبقہ ہے۔ اس کا تاریخی فرض ہے کہ وہ استحصالی طبقے کا تخت الٹ کر اس پر قابض ہو جائے جسے اس نے پرولتاری ڈکٹیٹر شپ یا عوامی آمریت کا نام دیا۔

عظیم مفکر لینن نے مارکس کے نظریئے سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے یہ اضافہ بھی کیا کہ انسان میں دو صلاحتیں موجود ہیں ایک سائنس دوسری آرٹ جن کا انسانی معاشرے سے الگ وجود نہیں۔ سماجی ضرورتیں ہی ان کی سست رفتاری یا سیمابی کیفیت کا تعین کرتی ہیں۔ اس نے بتایا کہ انسان کی لڑائی محض معاشی نہیں بلکہ تہذیب و کلچر کی بھی ہے۔ کلچر، آرٹ ادب، سائنس، خدا کے چند مقدس بندوں کی میراث نہیں۔ بلکہ اس پر ان انسانوں کا بھی حق ہے۔ جن کی گرسنہ نگاہیں ہیں۔ تپتے ہوئے ہونٹ ہیں۔ گرم سلاخوں کے شامیانوں تلے زندگی ہے لیکن ان کا شعور پختہ ہے۔ اس لئے وہ آرٹ کے وارث اور حیات نو کے نقیب ہیں۔ اس کے ساتھ لینن نے قوموں کے "حق خود ارادیت" کا بھی نظریہ دیا۔ جس نے سامراج دشمن تحریکوں کو جنم دیا ـــــ مارکس کے عہد میں سرمایہ داری کے اصلی خدو خال واضح نہیں تھے ـــــ لینن نے سرمایہ داری و سامراج کے اصلی چہرے سے نقاب الٹ دی ـــــ اس نے بتایا کہ سامراج دراصل سرمایہ داری کی آخری شکل ہے سامراج کے خلاف بنیادی قوت "قوموں کے حق خود ارادیت کی ہے ـــــ جس نے زمانے میں سامراج کے خلاف نئے تیشے بنائے تاکہ نئی پیکر شیریں تخلیق ہو سکے ـــــ لینن نے یہ بھی بتایا کہ انسانی شریعت میں دو طرح کی جنگ حلال ہے (۱) وہ جنگ جو اندرونی اور داخلی استبداد کے خلاف کی جائے (۲) جو بیرونی استبداد کے خلاف لڑی جائے ـــــ لیکن تیسری قسم کی جنگ جو منڈیوں پر اپنا خونی چنگل گاڑنے، انسان کو دھان اور تیل کی طرح بکاؤ مال سمجھ کر جنگ کا ایندھن

بننے کے لئے لڑی جائے وہ جمہوری شریعت میں حرام ہے۔

ان دونوں نظریات کا ردعمل تاریخ پر دو صورتوں میں ہوا ــــ پہلا نظریہ ہر عہد میں خواہ وہ غلامی کا دور ہو یا جاگیرداری، سامنتی ہو یا سرمایہ داری بالائی طبقے کے ہاتھ میں عوام کو غشی کی حالت اور حقوق سے محروم رکھنے کے لئے موثر حربہ ثابت ہوا۔ ایک طرف روشنیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تین طرف گھٹاٹوپ اندھیرا، جس میں نارسیدہ امنگیں۔ نادمیدہ حسرتیں ناتراشیدہ آرزوئیں۔ گرسنہ نگاہیں، سپتے ہونٹ، جھلسے بدن ــــ قضا و قدر، تزکیۂ نفس، ترک دنیا، چرچ و مسجد، خانقاہ و منبر۔ ایک طبقہ زکوٰۃ نکالتا رہا، دوسرا زکوٰۃ لیتا رہا ــــ برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں بیگاری الاؤنس social security (concelead form of exploitation) ہے جیسے جیتے جاگتے ادارے آج بھی موجود ہیں۔ جو خیرات کی "مہذب" شکل ہے۔

دوسرا نظریہ محنت کش عوام کے ہاتھ میں راکب تقدیر بننے اور استحصالی طبقے کو شکست دینے کا ہتھیار بن گیا ــــ بالائی طبقے نے جس وقت اکثریتی طبقے کو حقوق سے محروم کر کے انہیں پابہ زنجیر ان کی فکر کو اسیر اور خیالات کو جکڑ بند کیا۔ اس وقت محنت کے ہاتھ میں اشتراکی فلسفہ سرمایہ کی گردن میں آتش گز بن گیا جس نے زرگری کے جھکڑوں کو محنت کی باد صبا بنا دیا، بھوک و پیاس کی چلچلاتی دھوپ کو چاندنی میں بدل دیا اور جہل و استبداد کی مضبوط کلائی کو نظریہ کی توانائی سے مروڑ دیا۔ جس زمین پر بھی اس نظریہ کا ٹریکٹر چلا اس نے نیچے کی مٹی کو اوپر اور اوپر کی مٹی کو ہتوں میں دفنا دیا۔ نیا تیشہ کامراں ہوا۔ نئی پیکر شیریں تخلیق ہوئی اور فلسفۂ مادیت کے ماتھے پر فاتحانہ تبسم بکھر گیا۔

جوش کی شخصیت و شاعری اور انقلابی زاویۂ نگاہ کو سمجھنے کے لئے بظاہر ان فلسفیانہ مباحث سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے "عینیت" اور "مادیت" دراصل دو ایسے فلسفۂ حیات ہیں جن کی صرف معیشت اور سیاست ہی نہیں بلکہ تہذیب و کلچر، مذہب و سائنس، شاعری و ادب غرضیکہ زندگی کے ہر رخ پر چوٹ پڑتی ہے۔ ماہر

عینیت یہ ماننے سے منکر ہے کہ شعور کے جتنے بھی پہلو ہیں وہ سب خارجی مظاہر در دالبط کا نتیجہ ہیں ــــ شعور ارتقاپذیر ہے ــــ وہ تاریخی عمل کے ساتھ جڑا ہوا ہے ــــ نئے پیدا داری رشتوں کے وجود میں آنے سے عقل و شعور میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے ــــ وجدان مطلق قدر نہیں ہے ــــ عشق ہو یا وجدان یا شعور یہ سب سماجی تاریخ کے تابع ہیں۔ یہ زمان و مکان سے آزاد ہیں۔

گورکی نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ

"جب لوگ سمجھنا نہیں چاہتے یا سمجھنے کی طاقت کھو دیتے ہیں تو وہ اندھے اعتقاد میں پناہ ڈھونڈتے ہیں . . . ."

بورژوا سماج کا مقدر حروف تہجی کو زہر کی شیشی میں تبدیل کرنا۔ سائنس کو قاتل بنانا اور عقل و شعور پر حملہ کرنا ہے یہ سماج انسان کو عینیت کے اندھے اعتقاد میں پناہ لینے پر مجبور کرتا ہے۔ ایسے ادیب جو عشق و وجدان کے پردوں پر اڑتے ہیں وہ تغیر و تبدل سے خائف ہوتے ہیں۔ سماجی جمود توڑتے ہوئے انہیں ڈر لگتا ہے وہ طبقاتی معاشرے میں سانس لینے کے باوجود اندھیرے اور اجالے کے مابین کھڑے ہو کر غیر جانبداری کا اعلان کرتے ہیں اور اس طرح معاشرے کے مختلف طبقات میں Statusco کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ جان اسٹریچی کی کتاب "ادب اور فاشزم" اس سلسلۂ فکر کی نمایاں کڑی ہے۔

اردو ادب میں غالب کا کلام اس چادر آب کی مانند ہے جو سایۂ افق میں دور تک پھیلی ہوئی ہے ــــ غالب کی شخصیت "گنجینۂ معنی" ہے۔ پہلو در پہلو، تہہ در تہہ غالب نے زندگی میں کبھی شکست نہیں مانی۔ بلکہ وہ مخالف ہوا کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے ــــ یہ خود اعتمادی انہیں ان کی آہنی عقل اور شعور کی شعلگی نے عطا کی۔ گو وہ سرآن "روشنیٔ طبع" کے ہاتھوں "بلا" میں گرفتار رہے

لیکن عقل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سر سید احمد خاں کی مرتب کردہ آئین اکبری
پر یہ تاریخ ساز جملہ لکھ دیا

" مردہ پروردن مبارک کار نیست "

اور پھر اپنی یہ معرکتہ الآرا نظم لکھ کر اپنی شعور کی پختگی کا اعلان کر دیا۔

صاحبان انگلستاں را نگر   شیوۂ انداز اینیاں را نگر

غالب کا شعور ہمہ جہت، ہمہ رنگ، ہمہ گیر تھا۔ اس لئے انہوں نے ناسا عد
حالات میں فکر و فن کی شمع "عشق و وجدان" نہیں عقل کی روشنی میں جلائے رکھی۔ اجتہاد
نے ان کی ذات کو جلوۂ صد رنگ بنائے رکھا ـــــــ غالب کی مثنوی " ابر گہر بار"
کا ایک حصہ "مغنی نامہ" ہے۔ جو عقل و خرد کی بزرگی و برتری، بڑائی و بلندی، اور گہرائی و
گیرائی پر حرف آخر کا حکم رکھتا ہے ـــــــ خرد نے غالب کے الفاظ میں "آفرینش
کی رقم سنج کو درست کیا ـــــــ خرد ہی ہے جو انسان کے تمام زاویہ ہائے نظر کی تطہیر کرتی ہے۔

غضب را نشاط شجاعت دہد
ز خواہش بہ عفت قناعت دہد
منتہائی شائستہ عادت شود
نظر کیمیائے سعادت شود

حضرت جوش کا تعلق غالب کی آفتابی نسل سے ہے ـــــــ ان کی عقل پرستی جدید عہد
کی عقلی و سائنسی رعنائیوں کو سمیٹے ہوئے ہے ـــــــ آج سے تقریباً سو سال قبل کی ایک تحریر
میں وہ عقل دشمنی اور ذوق کم نگہی کے ہاتھوں زندگی کے ہمہ گیر نغمے میں جمود، سکوت، تعطل،
افسردگی اور تقلید پر اس طرح اظہار تاسف کرتے ہیں۔ " صد حیف کہ اپنے "سروں"
کو معزول کر کے ہم نے اپنے " کانوں " کو راہ نمائی کا منصب عطا کیا ہے۔ عقل کو کنپٹی مار
کر جذباتیت اور مجذوبیت کو گلے لگایا ہے اور " کھوپڑی " پر پاؤں رکھ کر " چھاتی "

کو ہم نے سروں پر بٹھالیا ہے اور اپنی اس روش کے چلنوں ان اقوام کے سامنے جو زندگی کے فرق پر تسخیر قوائے کائنات کا تاج رکھنے کی فکر میں سرگرداں ہیں ——— آج ہم جاہلوں، بیماروں، بھوکوں، ننگوں، ٹھگوں، اور بھک منگوں کی طرح سر جھکائے کھڑے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح کائنات ہم سے مایوس ہو چکی ہے . . . . . . ایوانِ حیات و فکر کائنات کا وہ مضبوط قفل جو صرف تفکر کی لو سے پگھل کر کھل سکتا ہے۔ ہم اسے موباف کے تاگوں اور ترکی ٹوپیوں کے پھندے سے کھولنے کی سعی فرما رہے ہیں . . . . .

پس جس نے پہلے نہ سنا ہو وہ اب سن لے کہ جس وقت تک ہم اپنے آپ کو سائنٹفک مزاج کے سانچے میں نہیں ڈھالیں گے۔ آگاہی و دیدہ وری کے بغض سے توبہ نہیں کر لیں گے سماعت کے میدان میں کبڈی کھیلتے اور عقل کا نام سنکر دولتیاں جھاڑتے رہیں گے۔ اس وقت تک زندگی ہم سے منہ موڑے رہیگی . . . . .

یہی وہ خیالات ہیں جن کا اظہار وہ شاعری میں اس طرح کرتے ہیں۔

جس کا ہو سنی سنائی باتوں پہ مدار
کس طرح اٹھا سکے، حقائق کا وہ بار
کیونکر وہ بڑھے شہر معارف کی طرف
جس قوم کی کھوپڑی پہ ہوں کان سوار

منطق کو سر نہ پا کیا ہے ہم نے
اوہام کو تاج زر دیا ہے ہم نے
اب تک نہیں اترا ہے وہ زہر اقوال
بچپن میں جو کانوں سے پیا ہے ہم نے

اعضائے جنوں پہ لرزہ طاری ہو جائے
ہر موجِ نفس ایک کٹاری ہو جائے
رکھ دے شانے پہ ہات اگر عقل کبھی
تو عشق کے منہ سے خون جاری ہو جائے

ایماں کو خرد کے روبرو لایا ہے
اور بحث کی دل میں آرزو لایا ہے
کیا اس سے مرے الاؤ پہ آئے گی آنچ؟
یہ اوس کی ایک بوند جو تو لایا ہے

اس دھن میں کہ دل عقل کے شیدا ہو جائیں
آفاق کے اسرار ہویدا ہو جائیں
مدت سے گرا رہا ہوں تخمِ افکار
شاید کہ نئے درخت پیدا ہو جائیں

کھولا ہے تو ہر ایک گرہ کو کھولو
منطق کی ترازو پہ ہر اک شے تولو
مانا کہ یہ عالم ہے کسی کی ایجاد
اور علتِ ایجاد ہے کیا؟ اب بولو

اس دور میں بھی عقل ہے صیدِ اکراہ
ہر داعئی اندیشہ پہ اٹھتی ہے نگاہ
وجدان کے ساحل پہ بحکمِ فقہاء
حکمت کی درآمد و برآمد ہے گناہ

افکار سے ہوتی ہے طبیعت ہلکان
اقوال پہ ہو رہی ہیں جانیں قربان
سر کے میدان میں ہے اک عالم ہو
کانوں پہ کھڑے ہیں لاکھوں الوان

یہ گرد ہے؟ دامن سے جھٹک دوں؟ بولو
یا وہم کے سوپ میں پھٹک دوں؟ بولو
اے خلد بریں کے ابلہانِ اعظم
اس عقل کو کس کے کھڈ میں پٹک دوں؟ بولو

حضرت جوش کی عقل پرستی بدرِ کامل کی طرح ہر تیرگی کو کاٹتی اور زندگی کے آنگن میں چاندنی چھڑکاتی ہے۔ یہ ابہام و وجدان سے گریزاں، مابعد الطبیعات کے کھوکھلے نعروں سے افسردہ، اور "عشق و جنوں کی تیزی سے لرزاں ہے۔

فغاں کہ عشق و جنوں کی چلی وہ صرصرِ تیز
کہ بجھ گیا سرِ محفل چراغِ عقلِ سلیم
یہ نکتہ جوش دلوں میں اتار دوں کیونکر
کہ سیلِ عشق نہیں جوئے عقل ہے تسنیم

غلط کہ کود پڑے تھے خوشی سے شعلوں میں
بجبر آگ میں جھونکے گئے تھے ابراہیم
مبلغانِ غلط بینِ عشق کو اب تک
خبر نہیں کہ یہ قرآن کا ہے لفظِ رجیم
خدا گواہ کہ امّ الکتاب کی رو سے
خرد ہے "خیر کثیر"، اور خدا "علیم و حکیم"
لگے جنوں کو وہ ٹھوکر کہ دم نکل جائے
قدم بڑھائے اگر بے عنانِ عقلِ سلیم
ہزار جلوۂ انجم اور ایک پرتوِ مہر
ہزار ضرب کلیم اور ایک حرفِ حکیم

جنوں کے در پہ سجدوں کی بارشیں ہوتے دیکھ کر ستارہ تولتی آنکھیں، گیتی نگہ عقل یوں تڑپ اٹھتی ہے۔

آفاق میں جو کچھ ہے وہ دانا کی نظر ہے
وجدان نہیں عقلِ جہاں سنج نظر ہے
دل مرکزِ اندیشہ، نہ عمل جائے خبر ہے
انسان کی دولت ہے کوئی چیز تو سر ہے
اے نیند میں ڈوبے ہوئے انسان کے سر جاگ

جوش کی عقلِ تجلی نقاش "ایک مکالمہ" میں جو "مابین بندہ و خدا" ہے وہ جنون کی روایت میں درایت کے گہر ہائے آبدار یوں ٹانکتی ہے۔

بھڑکا حریم قلب میں عشق و جنوں کی آگ
عشق و جنوں کی آگ خیال آفریں نہیں
دل کی طرف رجوع ہوائے کشتۂ دماغ
دل طفل کم نگاہ ہے آفاق بیں نہیں
مرغانِ بے نوا پہ جھپٹ بہر مشقِ ناز
انسان ہوں عقاب لئیم و لعیں نہیں
ہیں تجھ پہ ختم گیتی او سپر دلیل عقل
حکمت پناہ یہ روشِ نکتہ بیں نہیں
کانوں سے رشتہ جوڑ عنانِ دلیل توڑ
وہ مردہ ہے جو گرمِ گماں و یقیں نہیں
دیدار کی تڑپ ہے تو عرش بریں کو دیکھ
کیا جلوہ گاہِ ناز یہ فرش مبیں نہیں
اٹھ غیب کی زمین پہ رکھ دین کی بنا
مبنی جو غیب پر ہو وہ افسوں ہے دیں نہیں

——— عظیم المرتبت مفکر ہیگل کا قول ہے کہ "آزادی عقل کی صورت میں تحقیق بنتی ہے۔" یعنی عقل کی مخالفت کے نتیجے میں انسان کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ عقل کی یہ آواز گنبد عالم میں گونجی۔ جوش کی عقل پرستی ہیگل کی آواز کی کھنک ہے۔

——— ان کی معرکتہ الآرا نظم "موجد و مفکر" ان کی سائنسی فکر اور تعقل و تفکر کے کروڑوں معجزوں کا عطر ہے۔ یہ وہ نظم ہے جو دنیا کی عظیم ترین تخلیقات کے مقابلے پر رکھی جا سکتی ہے ——— اس نظم میں شاعر نے مادے اور خیال، جس

کی جانب پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ دو نظریئے حیات ہیں ایک خیال کو مادے پر اور دوسرا مادے کو خیال پر ترجیح دیتا ہے ـــــ جوش نے اس عظیم المرتبت نظم میں خیال اور مادے کی کشمکش کو پیش کر کے تصور مادیت کو جس کے وہ بہت بڑے مبلغ ہیں اور جوان کی عقل پرستی کی دلیل ہے ۔ اسے ابھارا ہے ۔ یہ اردو کی عظیم اور طویل ترین نظم ہے ۔

مسکرا کر جب ہوئی طالع تمدن کی سحر
جنگلوں سے شہر کی جانب مڑی فکر بشر
رسمسائی آرزوئے بام، چونکا ذوقِ در
کشتِ خاکِ تار سے اگنے لگے شمس و قمر

خوشۂ حسن زمیں، لیں، ناز سے ہکنے لگا
داب کر دانتوں میں انگلی، آسماں تکنے لگا

ہر اشارے کو صدا بن کر نکھرنا آ گیا
پھر صدا کو، لفظ میں ڈھل کر، سنورنا آ گیا
لفظ کو آہنگِ نو پا کر، ابھرنا آ گیا
خاکِ صامت کو، بالآخر، بات کرنا آ گیا

لب ہلے تو، کشتیاں چلنے لگیں اعجاز کی
نکر ائں ان کو سواری مل گئی آواز کی

شاہراہ عام ترشی، مانگ نکلی شہر کی
روشنی کی موج نے، اس مانگ میں افشاں چنی
تاب افشاں، جدول مقیش میں ڈھل کر بنی
مشعلیں لویں جگمگائیں نبض جب چلنے لگی

سازِ شب سے نغمہ ہائے صبح دم پیدا ہوئے
بستیاں مڑنے لگیں، گلیوں میں خم پیدا ہوئے

سر جھکایا جہل نے پھر علم کے دربار میں
دائرے بننے لگے، جنبش ہوئی پرکار میں
آگئی روح نبوت، معرضِ گفتار میں
سبزۂ آیات نکلا، گلشن انوار میں

اور جب اس سبزے میں، دریا کی روانی آگئی
نوع انساں کی مسیں بھیگیں، جوانی آگئی

پتھروں کو پیستی، شیشوں کو پگھلاتی ہوئی
کارخانوں کے دھویں میں پیچ و خم کھاتی ہوئی

ارتقا کا بیان اس طرح ہوتا ہے

رقص میں کب سے ہے یہ رقاصۂ جادو ادا
رنگ و لو کا یہ ستارا جس میں ہے یہ ریل پیل
زندگی کا جس میں کھیلا جا رہا ہے کب سے کھیل
یہ کرہ یہ آب و گل کی کارگاہ ہست و بود
قبل از پیدائش تاریخ ہے جس کا وجود
ذہن میں آتا نہیں اندازہ ماہ و سال کا
عمر کیا ہے اس تماشا گاہ ابر و باد کی
غور کرتے وقت رک جاتی ہے سانس اعداد کی۔
یہ مہ و خورشید یہ سیارگان ہمنشیں
اور انہیں کے ساتھ یہ گردندہ و غلطاں زمیں
ایک ہی تجلے میں رقصاں تھے یہ سب آتش جمال
جن کے گرد اگرد تھا لرزندہ اک شعلوں کا جال

اس کے بعد شاعر نے زمین کی تخلیق کی بڑی شاندار تصویر کھینچی ہے۔

صبر لیکن مدتوں کے بعد کام آ ہی گیا
تیرہ شب کو روز روشن کا پیام آ ہی گیا
مژدۂ ہستی لئے موج صبا آنے لگی
قلزموں نے ارغنوں چھیڑا زمیں گانے لگی
اور پھر اک دلفریب و دلنشیں انداز سے
خاک سے پودوں نے سر اپنے نکالے ناز سے
اور پھر سبزے کی جنبش سے زمیں لہرا گئی
اس ستارے کی مسیں بھیگیں جوانی آ گئی

اور پھر کچھ تھم کے اٹھی ایک موج سرخوشی
قلزموں میں زندگی کی اولیں جنبش ہوئی
خاک نے انگڑائی لے کر اپنے جوڑے کو چھوا
آئی سطح بحر سے میلاد خوانی کی صدا
زندگی کی طرفہ جنبش سے ہلی روح جمود
اولیں مضراب سے لرزاں ہوا تارِ وجود
کونپلیں بن بن کے پھوٹے خاکداں کے ولولے
مچھلیوں کی شکل میں ابھرے ارادے بحر کے
گاہ کی نبضیں بھی زیر کہکشاں چلنے لگیں
پانیوں پر سانس لیتی کشتیاں چلنے لگیں
دہر کے تاریک گوشے تک منور ہو گئے
زندگی کی سانس سے جھونکے معطر ہو گئے
زندگی کیا دولت بیدار ادراک و حواس
زندگی آواز اشارہ گیت آگاہی قیاس
زندگی موج شعور و جوئے دانش زندگی
سیل احساسات و طوفاں گاہ جنبش زندگی
خسرو گردوں گرداں شاہ گیتی زندگی
زندگی تابندگی رقصندگی رخشندگی
شعلہ پرور شعلہ پیکر شعلہ افشاں زندگی
پرفشاں جنباں رواں جولاں غزل خواں زندگی
اس ستارے کی امنگوں کی روانی زندگی

تند و طوفانی عناصر کی جوانی زندگی
منتشر تاریخ دنیا کی مؤلف زندگی
دین کے رنگیں صحائف کی مصنف زندگی
زندگی سالار بحر و بر اسیر برق و باد
دھر کا دل، خاک کی معراج، فطرت کی مراد
میر عالم فاتح پیدا و پنہاں زندگی
کردگار انبیا خلاق یزداں زندگی

سوچ تو کس منزل طوفاں سے آئی ہے حیات
کتنی موتوں کو کچل کر مسکرائی ہے حیات
ابتدائی منزلوں کی بے پر و بالی کو دیکھ
قہر افگن مادے کی ہمت عالی کو دیکھ

اس نظم میں حضرت جوش نے عشق و وجدان کی "شیشہ گری" کو عقل کی آہنی ضربوں سے چکنا چور کر دیا ہے اور حقائق کو شعری پیکر میں ڈھال کر قندیلیں روشن کی ہیں۔ ساکن الفاظ کو متحرک، اور متحرک تصورات کو متلاطم بنانا حضرت جوش کا ہی اعجاز ہے۔ عقل کے میدان میں ان کا قلم ایک ایسا درخت ہے جس کی جڑیں زمین میں اور چوٹیاں فضاؤں میں ہیں ——— حضرت جوش کی عقل پرستی کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

(اول) حضرت جوش کی عقل پرستی "وجدان کی گنگ وادی" میں شعور کے وہ کرم" کا گجر ہے۔ جو مہکتے الفاظ اور پختہ فکر سے جدید عہد کی تازہ بصیرت سے اپنا رشتہ

استوار کرتی ہے۔

(دوئم) ان کی عقل پرستی کہر میں دبی ہوئی ہمالہ کی چوٹی نہیں۔ بلکہ کوہ قاف پر نکلی ہوئی سنہری صبح ہے۔ جو عالمانہ سنجیدگی اور پر وقار مطالعہ کی روشنی میں اسباب و علل کی کڑیوں کو جوڑ کر ان کے روابط و مظاہر سے رشتہ استوار کرتی اور نتائج اخذ کرتی ہے۔

(سوئم) حضرت جوش کی عقل پرستی زندگی کی مثبت اقدار، اور ادب کی زندہ روایات میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے ——— ادب اور سائنس کی رقیبانہ چشمک کو مٹا کر انہیں ایک دوسرے کا حریف بنانے کے بجائے زندگی کی ترقی و کامرانی میں دونوں کو ممد و معاون مانتی ہے اور اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ کوئی عہد صرف سائنس یا صرف ادب کا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی رفتار تیز کرنے اور اسے "خوب سے خوب تر" کی منزل کی طرف لے جانے میں دونوں کا اہم مقام ہے۔

(چہارم) ان کی عقل پرستی اس بات پر ایمان رکھتی ہے کہ آزادی و انقلاب کی جد وجہد میں کوئی انسان "آفاقی" نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس زمین کے مسائل طبقاتی جد وجہد کو نظر انداز کر کے محض "عشق و جنوں" کے ذریعے حل کیے جا سکتے ہیں۔ انسان خواہ کتنا ہی "آفاقی" اور "مرد کامل" کیوں نہ ہو وہ زمان و مکان سے آزاد نہیں۔ جس وقت تک دنیا میں طبقات موجود ہیں عشق کے اضطراری جذبہ میں ایسے انسان کی جستجو صرف واہمہ ہے اور بس۔

(پنجم) عقل و شعور کے مقابلے میں "عشق و جنوں" یعنی ایک اضطراری کیفیت و سیاست و ادب کی اساس بنانا عنیت کی دھوپ میں انسانی ذہن کو پگھلانا ہے۔ عقل کی روشنی میں اپنے مقصد سے باخبر ہو کر لکھنا اس سے قطعی مختلف ہے جو صرف "وجدان و عشق کے دھندلکے میں لکھا جائے۔

(ششم) حضرت جوش کی عقل اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ طبقاتی سماج میں غنیت کا فلسفہ ظلم پر پردہ ڈالنے کے ہم معنی ہے۔ ایسے سماج میں غیر جانبداری کا نعرہ بھی گمراہ کن ہے۔ وہ آہنی استدلال کی روشنی میں ظالم و مظلوم کے درمیان "خط امتیاز" کھینچ لیتے ہیں برابری کے معنی محمود و ایاز کو صرف نماز کی صف میں کھڑا کرنا نہیں ہے کیونکہ نماز کے بعد محمود مسند نشین ہے اور ایاز در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے انکی عقل پرستی معاشی آزادی اور معاشی برابری کو اصل حقیقت سمجھتی ہے۔ اور اس حقیقت کا اعلان کرکے وہ عوام کے سامنے اپنی جانبداری کا اعلان کرتے ہیں۔

اے مردِ خدا عشق کی تلقین نہ کر
اے صید جنوں عقل کی تدفین نہ کر
کہ "خیر کثیر" کو نہ کارِ ابلیس
حکمت ہو تو قرآن کی توہین نہ کر

یا

بڑھا ہے جانبِ انساں دراتیوں کا شعور
مڑا ہے سوئے بیاباں، رواتیوں کا مراق
عروس دانشِ حاضر الٹ رہی ہے نقاب
جھلک رہی ہے انگوٹھی، دمک رہا ہے بلاق
اٹھا رہا ہے ادب ساز منطق و حکمت
دکاں بڑھاؤ اب اے مطربانِ وصل و فراق
اب آدمی کے قدم آسمان چومے گا
اب آسمان کا ہو گا زمین سے الحاق
نکل رہا ہے جلوسِ فراقِ فکر جدید
کہ ہر ہے ذریتِ عشق و امتِ اشراق

ان کی عقل پرستی لوبان میں بسے ہوئے ذہنوں کو آزاد کرانا چاہتی ہے۔ اسی طرح حضرت جوش کی عقل پرستی مظلوم کے ہاتھ میں ہتھیار اور ظالم کے لیے پیغام اجل ہے جو عوام کو صرف اندھیرا اجالا نہیں دکھاتی بلکہ اس کی درستگی اور نادرستگی کا تجزیہ بھی کرتی ہے حضرت جوش کی عقل پرستی "عشق و جنون" کے سامنے استدلال کی مصدق آواز، درآیت کا نکھرا نکھرا، آہنی دلائل کا بلوریں باب، اور وجدان کے دشت میں چراغ داوری ہے۔ جو بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتی اور نشانِ منزل کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی عقل پرستی جدید عہد کی دانش سے جڑی ہوئی ہے جو ہر موڑ پر بصیرت کے چراغ جلا رہی ہے

طبعِ انسانی کو دے سکتا نہیں جو روشنی

نوعِ انسانی کا وہ آقا نہیں بنتا کبھی

آدمی کو جو غذا دیتا نہیں ادراک کی

امتوں کا مقتدا بنتا نہیں وہ آدمی

قبلہ گاہ اس شخص کو انسان بنا سکتا نہیں

ذہنِ انسانی کو جو آگے بڑھا سکتا نہیں

مذہب (روایت و درایت)

مذہب کیا ہے ؟ اس کی غرض وغایت کیا ہے ؟ تاریخ کے کس موڑ پر یہ ظہور پذیر ہوا ؟ ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ سوالات مفکرین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں ۔

تمام مباحث سے قطع نظر مذہب دراصل مشتمل ہے دو باتوں پر ، ایک اس کا مابعد الطبیعاتی نظام دوسرا معاشرتی نظام ـــــ مابعد الطبیعاتی نظام میں بنیادی اہمیت خدا کے تصور کی ہے ـــــ مگر یہ تصور الٰہ دراصل انسانی ذہن کی علمی سطح سے جڑا ہوا ہے ـــــ تاریخ کے مختلف ادوار میں جیسی انسانی ذہن کی سطح تھی اسی نسبت سے تصور الٰہ اس کے ذہن میں بیدار ہوا ـــــ اس نے اس کائنات میں مختلف شکلوں میں ایک طاقت کو محسوس کیا اور اس طاقت کے ظاہری پہلوؤں میں اس کی نظر الجھ کر رہ گئی ۔ بقول جوش

" طفیانِ ذوق دید صمد ہے صنم گری "

تاریخ میں جس وقت طبقات وجود میں آئے ، سرپرستی ، قبائلی اور جاگیرداری نظام نے جنم لیا ـــــ تو بالائی طبقات نے عام انسان کی ذہنی و جذباتی کیفیات ، اس کی کمزوریوں اور محرومیوں کو دور کرنے کے بجائے معصوم جذبات کا استحصال شروع کیا ۔ ہر آمر نے اپنے آپ کو خدائی طاقت کا اوتار و جانشین قرار دیا ۔ اور خود بتوں کے اندر مختلف ناموں سے بیٹھ گئے ۔ عام آدمی کی نفسیاتی مرعوبیت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ایسا معاشی و معاشرتی نظام اس پر مسلط کر دیا جس میں حقوق اپنے لئے اور ذمہ داریاں عام انسان کے لئے تقسیم کر دی گئیں ۔

یونان ، ہندوستان اور مصر کے صفحات کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے ۔ چونکہ محروم طبقے کو اپنی زندگی پر حق نہیں تھا اس لئے ہر طاقت کو جو کائنات میں تھی اسے متشکل بنا کر اس نے اس کی پوجا شروع کر دی ، ہر بت کے ساتھ ایک پروہت تھا ۔ جو مال و دولت کے علاوہ حیوانوں کی قربانی سے لے کر انسانی جانوں تک کی

قربانی لیتا۔ اور عوام کو ثوابِ دارین کی بشارت دیتا۔ اس کے لئے انسانی ذہنوں کو مفلوج کرنا بنیادی شرط تھی۔ تاکہ عام انسان کے ذہن سے احساسِ زیاں جاتا رہے۔ بقول جوش

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یوں جبر کے تلے عام انسان پستا رہا۔ خوش شکل و بدشکلی کے دیوی و دیوتا بنائے گئے ــــ عورتوں کی دیوتاؤں کے ساتھ شادی ہو جاتی اور پھر ایسی عورتیں چکلے خانوں میں بیچ دی جاتیں ــــ حقوق ناآشنا انسان بتوں کی چوکھٹ پر سجدہ ریز اپنا سب کچھ لٹاتا رہا۔

صاحبو ایسا خدا خالق نہیں مخلوق ہے
یہ خدا تو آدمی کے ذہن کی ایجاد ہے

(جوش)

بہر حال تاریخ کا دھارا سیاہی اور سفیدی کے درمیان بہتا رہا۔ مختلف تہذیبوں نے ایسے مفکرین کو بھی جنم دیا جو مذہب کی زبان میں پیغمبر کہلائے جنہوں نے بتوں کے اس طلسم کو توڑنے کی کوشش کی جو پیکرِ محسوس بن گئے تھے ــــ انہوں نے جمود کو حرکت، نفرت کو پیار، اور گمان کو یقین میں بدلنے کی سعی کی ــــ کنفیوشس، مہاتما بدھ، زرتشت، سقراط، عیسیٰ اور محمدؐ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں تھیں جنہوں نے انسانیت کو "مقام الوہیت" پر پہنچایا۔ رسول کریمؐ نے انسان کو ہر پہلو سے آزادی کی راہ دکھائی اور پاپائی نظام اور ملائیت کو جو عبد و معبود کے درمیان واسطہ بنے انسانیت کا استحصال کر رہے تھے۔ ان سے نجات دلائی۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں۔

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود و ماند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش | بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و سلطان و پاپا و امیر | بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرت او دوں شدہ | نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ

اور پھر انسان کو رسول کریمؐ نے نئی امیدوں کا اس طرح نیا احساس عطا کیا

تا امینے حق بہ حقداراں سپرد | بندگان را مسندِ خاقاں سپرد
قوت او ہر کہن پیکر شکست | نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست

ان پیغمبروں نے ایک ایسے خدا کا تصور دیا جو انسانی شعور و احساس سے ماورا تھا لیکن یہ پیغمبر بھی کچھ تو اس وجہ سے کہ انکی اور ساتھ ہی اس زمانے کی عقلی سطح اتنی بلند نہیں تھی۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ مصلحت اس بات کی متقاضی تھی کہ مالبعد الطبیاتی نظام کی معاشرتی سطح قیام امن کے لئے استعمال کی جائے تو انہوں نے مالبعد الطبیعی نظام کو قائم رکھا جس میں ایک خدا کا ذہنی تصور اور خدا کے عطا کردہ قوانین کا تصور، حیات بعد الموت کا تصور اور مرنے کے بعد جنت و دوزخ کا تصور موجود تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے اس بنیاد پر معاشرتی اقدار کا ایسا نظام بنایا جس میں انسان کو پہلی مرتبہ مختلف قسم کی غلامی سے آزاد کرایا گیا۔

دوسرے اور مذاہب کی طرح اسلام نے انسان کو "انی جاعلً فی الارض خلیفہ" کہہ کر نائب خدا کے مقام پر فائز کیا اور پوری کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا کہ وہ جس طرح چاہیں اس سے فائدہ اٹھائیں ـــــ غالب نے قرآنی آیات کی یوں تشریح کی

جائیداد نوشتئ رندان ہے شش جہت
اور غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

دوسری جانب بالائی طبقات نے اپنے استحصالی نظام کو باقی رکھنے اور اسے پائیداری بخشنے کے لئے مختلف نظریات وضع کئے جس میں ایک یہ بھی تھا کہ دنیا

" بے ثبات ہے " سراسر مایا جال " ہے ۔ " مومن کے لئے قید خانہ " ہے ۔
" اس کا چاہنے والا سگِ نامراد ہے ۔ " اس طرح عام آدمی کو زندگی کی رنگینیوں و رعنائیوں سے دور کر دیا ۔ حالانکہ

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشید عالمتاب تھا

غرضیکہ مختلف مفکرین نے انسانیت کو طلسم سامری سے نکالنے کی کوشش کی جس نے ذہنِ انسانی کو صدیوں سے جکڑ رکھا تھا ۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود عصری جبر یعنی Thinking climate سے عام انسانی ذہن کو نکالنا دشوار تھا ـــــ قرونِ وسطیٰ میں جبکہ قبائلی نظام کا جبر انسانی ذہن پر مسلط تھا یہ امید رکھنا کہ انسان ان اقدار کی گرفت سے لے کر آزاد ہو جائے گا ، ممکن نہیں تھا ۔ چنانچہ معاشی ، معاشرتی اخلاقی جبر ، شکلیں بدل بدل کر اس کے ذہن پر حملہ آور ہوتی رہیں ۔

لیکن جیسے جیسے علم نے ترقی کی ، انسانی ذہن میں کشادگی آئی ۔ مختلف عمرانی و سائنسی علوم نے ترقی کے مدارج طے کیے ۔ انسانی تجربات وسیع ہوتے گئے ـــــ پیداواری رشتے تبدیل ہونے سے فکر نے بھی کروٹ لی ۔ قبائلی و جاگیرداری نظام کے چنگل سے انسان نے نجات حاصل کی تو عام انسان کے ذہن میں اپنے حقوق کا شعور بھی پیدا ہوا ۔ اس نے استحصالی طبقے کے اصل چہرے کو دیکھا ان کے مکر و فریب کو سمجھنا شروع کیا ۔ اس کی گوناگوں شکلوں کا ادراک حاصل ہوا ۔ تو اب انسان نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ اخلاقی اقدار اوپر سے تھوپی نہیں جا سکتیں بلکہ اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ سب سے پہلے معاشی و معاشرتی قدروں کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے ۔ ثواب و عذاب ، " اچھائی اور برائی " سب اضافی اقدار ہیں مطلق نہیں ۔

ماحول و نفس و تربیت و صحت و شعور
ان سب کے اعتدال میں پڑتا ہے جب فتور
کرتا ہے امر خیر سے انسان کا دل نفور
حالات کی خطا ہے کسی کی خطا نہیں
جز در گزر عام اور کوئی راستہ نہیں
(جوش)

اقبال کا خدا سے رشتہ مختلف ہے ــــ ابتدا میں چاند، سورج، ستارے ان میں تحیر کا جذبہ بیدار کرتے ہیں ــــ کائنات کا راز معلوم کرنے کی خواہش بیدار ہوتی ہے۔ تشکیک کی منزل پر اپنے آپ کو پاتے ہیں۔ لیکن مذہبی گھرانے کے اثرات اور مولانا روم کی وابستگی جلد ہی انہیں تشکیک کے دروازے سے گذرنے کے بجائے اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جسے "یؤمنون بالغیب" کی منزل کہا جاتا ہے۔ جہاں "اگر" "مگر" اور شک کی گنجائش نہیں، اس لئے شک کے بجائے وہ اپنا ذہنی سفر "یقین" ہی سے شروع کرتے ہیں۔

یقین مثل خلیل آتش نشینی
یقین اللہ مستی خود گزینی

عہد حاضر کی کشمکش، خدا و سائنس کا ٹکراؤ دیکھ کر اکثر ان کا ذہن شک میں مبتلا ہوتا ہے

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغان صبح گاہی
اماں شاید ملے "اللہ ہو" میں

لیکن جلد ہی شاید کا لفظ انہوں نے اپنی لغت سے نکال دیا اور "اللہ ہو" پر شاعری

کی بنیاد رکھ کر یقین کامل حاصل کیا۔

موجودہ سائنسی دور میں ہر شے کے اسباب و علل پر نگاہ ڈالکر حقائق کو پانے کی جستجو جاری ہے ــــــــــ خدا کا تصور بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر دور نے اپنے جغرافیائی ماحول اور سیاسی حالات کے مطابق خدا کا تصور وضع کیا۔ علم کی ابتداء تشکیک ہے انتہا، عرفان و آگہی، علم کی تشکیکی تادیب میں مبتلا ہو کر انسان یا تو جبری ہو جاتا ہے یا قدری۔ جبریت مایوسی کا اظہار ہے تو قدریت احساس خود بینی کو جنم دیتی ہے۔ جبریت کے ماننے والے کو کائنات میں اپنی جگہ نظر نہیں آتی۔ لیکن قدریت صالح اور تنومند تصور ہے۔ " دیر و حرم کے امتیاز سے بلند۔ آزادیٔ ضمیر۔ آزادی فکر و نظر، آزادی انسان۔ حضرت جوشؔ جبریت کے فلسفے سے متاثر ہونے کے باوجود قدری ہیں۔ فکری اعتبار سے غالبؔ کے بہت نزدیک شکک کی حیثیت سے مذہب و خدا اور کائنات سے متعلق مختلف سوالات ان کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ جن کا جواب وہ خدا سے چاہتے ہیں۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے " حضرت جوشؔ کے مزاج میں " ابتدا ہی سے خطرناک کمانیاں کھل رہی تھیں " روایت شکن ذہن اسباب و علل پر غور کر رہا تھا۔ ہر نظریہ عقل کی کسوٹی پر کسا جا رہا تھا۔ مختلف سوالات تعقل و تفکر کے پیمانے سے نلپے جا رہے تھے۔

" ہر فنکار کو اپنے شاہکار سے محبت ہوتی ہے۔ اس پر نگاہ کر کے دریافت کرتا ہوں کہ کیا کوئی مصور تصویر بنانے کے بعد اس کی ناک کاٹ دے گا؟ کوئی مطرب گانے کو بے سرا بنا دے گا؟ . . . . کوئی سنگتراش تاج محل تراشنے کے بعد اسے توڑ دے گا؟ یہ بات فنکار کی فطرت کے خلاف ہے . . . . . یہ فنکار کیسا ہے؟ ہم کو " احسن التقویم " بناتا ہے اور پھر بگاڑ دیتا ہے . . . . ؟ نفوس انسانی میں اتنی کجی کیوں؟ کہ رسولوں کو بھیجنے کی ضرورت پڑی؟ بنانے والے نے اتنا خراب کیوں بنایا . . . .

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

" اس خیر بیزار اور شر پرست دنیا میں محراب و منبر ہزاروں برس سے انسان کو خدا کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن گھنگھروں کی جھنکار اور جوبن کا ابھار انہیں اس طرف جانے نہیں دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں؟ خیر پھیلانے کے لئے ہزاروں انبیاء بھیجے گئے لیکن شر کے لئے کوئی یونیورسٹی نہیں بنی اور کوئی ادارہ معرض وجود میں نہیں آیا۔ پھر بھی مدھ ماتیوں کے نبوت بخش مکھڑوں کے لئے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں اور واعظوں کی سانس اکھڑ رہی ہے؟ رسولوں کی اتنی کثرت کے باوجود بنی نوع انسان کے شر کا میلان کیوں روکا نہیں جا سکا؟

" ایمان " کے متعلق لکھتے ہیں۔

دیکھے تو کوئی عقل و عقائد کا تضاد

وہ لحنِ تامل یہ خردشِ اجداد

میدان فقیہ میں جو شے ہے " ایمان "

ایوان حکیم میں وہ شے ہے " الحاد "

یہی وہ خیالات ہیں جس کی بنا پر حضرت جوشؔ کو ملحد قرار دیا گیا۔ حالانکہ اگر اس مسئلے کو عقل و خرد کی روشنی میں دیکھا جائے تو ذہنی الحاد کی بنیاد تو اس وقت پڑ گئی جب مذہب نے بتایا کہ " خدا قادرِ مطلق ہے۔ عدیم النظیر ہے " اور انسانی ذہن نے پلٹ کر سوال کیا " کیا خدا اپنا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے " یہ سن کر خدا یقیناً شرمندہ ہوا ہوگا کہ اس نے انسان بنایا تو خیر۔ لیکن اسے منطقی کیوں بنایا۔ مذہب کے بنائے ہوئے خدا کا بت تو تخلیق عقل کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔ سیاسی و سماجی تاریخ کے سفر میں جب خرد اکھوے پھوٹے تو خدا کو " ہفت آسمان " سے اتار کر زمین پر لایا گیا۔ اس خدا کی یہی وہ محبت تھی جس نے رومیؔ، عطارؔ اور اس وساطت سے مذہب

کو تصوف اور تصوف کو انسانیت پرستی میں تبدیل کیا گیا اور پھر انسان کو دیوتا اور اوتار کے لقب سے نوازا گیا جس نے ایک نئے فکری زاویے اور نئے نقطۂ نظر کو جنم دیا۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے سماجی حقیقت پسندی اور عقل پرستی جوش کے فکر کی اساس ہے۔ سیاست ہو یا معیشت، تہذیب ہو یا ادب، مذہب ہو یا لامذہبی انداز، عقل کی روشنی میں اسے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔

تقلیدی مذہب ان کے مزاج کے منافی ہے۔

اے ذریتِ کعبہ وائے آلِ کلیسا — پس خوردۂ اجداد ہیں تیرے نظریات

اقوال نیاگال ہیں فقط کان کی افیون — دیرینہ عقائد ہیں فقط ذہن کے عادات

یا

کہتے ہوئے یہ بات کہ اے قوم سبک سر

ہم لوگ ہیں اقطاب و مجاذیب و قلندر

ہم قاضئ حاجات ہیں ہم شافعِ محشر

لیٹے ہیں شبِ قدر کو آنکھوں میں گھما کر

اللہ کو بالیں پہ بٹھائے ہوئے مردے

یا

مردہ اقوال کے سیلے ہوئے تہہ خانوں میں

زندگی نقش بدیوار رہے گی کب تک

قصرِ افکار پہ اسلاف کے گھن کی آواز

ذہنِ اخلاق کی معمار رہے گی کب تک

جیسا کہ کہا گیا ہے وہ خدا کو علت و معلول کے رشتے سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔

اگر صاحب فہم ہے غور کر
کہ ہر نقش حجت ہے نقاش پر
مجازات پیدا حقیقت بھی دیکھ
گرفتار معلول علت بھی دیکھ

یا

اے پچھلے پہر کے غم گسار و بولو
اے نور کے ملگجے سے دھارو بولو
اس پردہ رنگ و بو میں پوشیدہ ہے کون؟
بولو۔ اے ڈوبتے ستارو بولو

یا

اتفاقی ہے یہ آمیزش آہ و آہنگ؟
یا کوئی صاحبِ فرماں ہے؟ کوئی کیا جانے
کارفرمائے دو عالم ہے کوئی زندہ شعور
یا توانائی بے جاں ہے؟ یہ کوئی کیا جانے
زینتِ گوش ہے کیا حلقۂ لحنِ داؤد؟
یا دفِ غول بیاباں ہے؟ کوئی کیا جانے
دین ہے صرف جگر دارِ حکیمانِ بزرگ؟
یا فقط شورِ فقیہاں ہے؟ کوئی کیا جانے
چشمۂ خیر ہے ماہِ رمضان و شبِ قدر
یا فقط وہمِ بزرگاں ہے؟ کوئی کیا جانے۔
خود سے نغموں کی یہ بارش ہے یہ رنگوں کی پھوار؟

یا کرن اوٹ میں پنہاں ہے؟ کوئی کیا جانے
علم۔ آشوبِ عقائد ہے یہ کہیے کس سے
عقل غارت گرِ ایماں ہے کوئی کیا جانے
عرشِ اعظم پہ فرشتوں کا غرورِ تسبیح
علمِ آدم سے پریشاں ہے۔ کوئی کیا جانے
زانوئے فکر پہ دمکی ہوئی پیشانی جوش
رحلِ آفاق پہ قرآں ہے کوئی کیا جانے

ہاں نوعِ بشر چیں بہ جبیں ہے اب تک
انسان "راہ راست" پہ نہیں ہے ابتک
اللہ کو ہو مژدہ کہ "سرکش" بندہ
تھا روزِ ازل جہاں وہیں ہے ابتک

یا

ہاں مشغلۂ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی رسمِ ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انساں سے ٹکر ایسی
ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

یا

اے شیخ بتا کیا یہی ہے باغِ رضواں
حوروں کا کہیں پتہ نہ غلماں کا نشاں
اک کنج میں خاموش و ملول و تنہا
بے چارے ٹہل رہے ہیں اللہ میاں

تحقیق و تجسس نہ دلیل و برہاں
پھر بھی مذہب پہ مر رہے ہیں انساں
اب دین کی جھولی میں دھرا ہی کیا ہے
کچھ ضابطے صحیفے اور کچھ گل ایماں

اے عابدِ سجدہ ریزِ حق کو پہچان
ان تیری دعاؤں سے خطا ہیں اوساں
تا چند رہے گا تجھ پہ ناداں طاری
دریوزہ گرِ اخلاق و گداگرِ ایماں

ذہنوں پہ چڑھے ہوئے ہیں صدیوں کے غلاف
ہر آن حریم وہم آباء کا طواف
ایماں ہے اسلاف کی آوازوں کا
اک شورِ بحرابِ خیال اخلاف

جو یہ ہے تو راہِ متانت سے آ میرے روبرو و بابِ حکمت سے آ

اس وقت طبیعات جس موضوع پر تحقیق کر رہی ہے اس میں انہوں نے atom یا جوہر میں چار بنیادی forces کا نظریہ قائم کیا ہے ایک strong force دوسری weak force تیسری Electro magnetic force چوتھی grand unifying force لیکن طبیعیاتی سائنس دانوں کا یہ تصور

ہے کہ دراصل ان چاروں Forces کی تہہ میں ایک ہی بنیادی force ہے جسے وہ grand unifying theory کہتے ہیں۔ اور اب سائنس جس سمت میں کام کر رہی ہے وہ یہ کہ G.U.T ان چاروں میں وحدتِ توانائی کو معلوم کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر سلام کو جو نوبل پرائز ملا اس میں اس کی تحقیق نے electromagnetic اور weak force کو متحد کر کے ایک force کی نشاندہی کی۔ اس طرح تین بنیادی forces میں اب جو تحقیق ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ مرکز کو توڑ کر اس کو بھی وحدت کی لڑی میں پرو دیا جائے۔

جوش توانائی مطلق کو کائنات میں جاری وساری دیکھتے ہیں

اور اسی توانائی مطلق کو آپ جوش کا تصور اللہ کہہ لیں۔ اس کے متعلق کہتا ہے۔

آیاتِ صفات کی تلاوت نہ کرو
جوئیندگیِ ذات میں غفلت نہ کرو
لفظ اللہ پردہ ہے جلوہ نہیں
اس حرفِ غلافی پہ قناعت نہ کرو

دوسرے مقام پر کہتے ہیں۔

دنیا کو تو بتائے گا یہ نکتۂ جمیل
یعنی ازل سے ایک توانائی جلیل
جسکی کوئی نظیر نہ جس کا کوئی عدیل
اس کارگاہِ وقتِ گریزاں کی ہے کفیل
اخلال وانجذاب نہ وہ انعکاس ہے
دنیا سے دور ہے نہ وہ دنیا کے پاس ہے
انسان کے مزاج کی اس میں نہیں ہے لو
وہ کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں ہے سوائے ہو
وہ شاہ نرم طبع نہ سلطانِ تند خو
وہ دلنواز دوست نہ ہمت شکن عدو
وہ پائے بندِ رسمِ وفا و جفا نہیں
جذبات جس پہ ٹوٹ پڑیں وہ خدا نہیں

ہاں دن کو تو کرے گا رات سے جدا وزنی حقیقتوں کو روایات سے جدا

داغوں سے تو احد کے ورق کو بچائے گا

تو کبریا کو دام عدد سے چھڑائے گا

اب باقی جو چیز رہ جاتی ہے وہ حضرت انسان ہے ۔ جس کی بزرگی و برتری بلندی بڑائی کے جوش عاشق ہیں ـــــــ اقبال بھی انسانی عظمت پر یقین رکھتا ہے ۔ وہ انسان کو تسخیر کائنات کا پیغام دیتا ہے ۔ انسانی خودی کو مقام بخشتا ہے جہاں خدائی مرضی انسانی مرضی کے تابع ہو جاتی ہے ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اپنی فکر کی بلندی میں اقبال ابتدا میں مذہب کی عائد کردہ تمام قدروں کو توڑ دیتا ہے جہاں وہ کہتا ہے ۔

در دشت جنونِ ما جبریل زبوں صید ے

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اور بعض مرتبہ شوخی میں اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں ۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں اپنا

یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

یا

ہیم ما گدائے تو یا تو گدائے ماستی

بہر نیاز سجدۂ در پسِ ما دویدۂ

فتنۂ دیر یک طرف شورشِ کعبہ یک طرف

از آفرینشِ جہاں دردِ سرِ خریدۂ

لیکن ایسا آزاد خیال انسان جس وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے پیغام کا ابلاغ ممکن نہیں۔ بغز اصطلات یا چھپا مذہبی جذبہ بیدار ہو جاتا ہے تو وہ اپنے پیغام کو پہنچانے کے لئے مذہبی اصطلاحات کا سہارا لینا شروع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے آخری دور میں ہو امطلقاً مذہب کی آغوش میں بیٹھ کر انسان معاشرہ اور فطرت کے مسائل حل کرتے ہیں۔

بہ مصطفٰے بہ رساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی اسیت

بہترین انسان کا تصور اقبال کے نزدیک مردِ مومن کا ہے۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
سارے جہاں سے غنی اس کا دلِ پاکباز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

اس طرح اقبال کی اپیل ایک مخصوص مذہب پر عقیدہ رکھنے والوں تک محدود ہو جاتی ہے ——

اللہ کا تصور غالب کے یہاں جدا ہے کیونکہ وہ روایتی مذہب کے قائل نہیں ہیں

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

دودِ قدح سے عیش تمنا نہ رکھ
صیدِ زِدام جستہ ہے اس دام گاہ کا

انسان کے باطن میں آویزش محض داخلی نہیں خارجی حالات کا پرتو ہوتی ہے

کیونکہ باطن کا وجود خارج سے باہر نہیں ـــــــ حضرت جوشؔ کی فکر کی کمانیاں جس وقت کھل رہی تھیں" اور وہ تحقیق کی کسوٹی پر خدا اور مذہب کے تصورات کو کس رہے تھے اس وقت ہندوستانی سیاست انقلابی تصورات و نظریات سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ ادب کی دنیا میں بھی ہنگامہ برپا تھا۔ ہندوستان ایک طرف اقتصادی بدحالی اور معاشی ناہمواری کا شکار تھا دوسری طرف مذہب کے نام پر انسانوں کو جہل اور تاریکی میں ڈھکیلا جا رہا تھا۔ ملک کا حکمراں طبقہ مذہب کے ٹھیکیداروں کی مراعات میں اضافہ کر رہا تھا تاکہ لوگ مذہب کی گولی کھا کر غنودگی کے عالم میں بستر مرگ سے اٹھنے کا نام نہ لیں اس مذہب پرستی نے نوجوانوں کو مذہب کے خلاف کھڑا کر دیا تھا۔ ڈاکٹر رشید جہاں۔ پروفیسر احمد علی فکر میں شعلے بھڑکا رہے تھے " انگارہ" انقلابی جذبات کا عکاس تھا۔ گو خدا اور مذہب کے خلاف خیالات جذباتی سطح پر نمایاں ہوئے تھے لیکن ہندوستانی نوجوانوں کی فکر کی عکاسی کر رہا تھا۔ شعور میں مستقبل واضح نہیں تھا۔ پھر بھی تقدیر پرستی اور مذہب فریفتگی نے انہیں اس نتیجے پر پہنچا دیا تھا کہ جب تک قوم " مذہب کے گورکھ دھندے" سے باہر نہیں آتی قوم کا صحیح منزل تک پہنچنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ جوشؔ نے عصر حاضر کی فکر سے ہم آہنگ ہو کر بندوں کے تراشے ہوئے خدا پر یوں تنقید کی۔

خونخوار کو پروان چڑھانے والے
کمزور کو خاک میں ملانے والے
شاہین بھی ہے کیا تری ہی ایجادِ لطیف
معصوم کبوتر کو بنانے والے

یا

کیا ظلم ہے تشنگی سے مرتے رہے
دم پیرِ خرابات کا بھرتے رہے

کتنی ہی شکایات کی ہوں آنچیں دل میں
پھر بھی ساقی کا شکر ادا کرتے رہے

" خدا رزاق ہے " مسلمانوں کا اس پر ایمان ہے لیکن انسانی محبت میں سرشار حضرت جوش جب بھوک اور پیاس کا لق و دق صحرا اپنے سامنے دیکھتے ہیں جس میں دور تک تری و شادابی نہیں ہے ۔ تو وہ انکار کی منزل پر آکر خدا سے اس طرح بغاوت کر بیٹھتے ہیں

اے موجد و خلاق مبارک باشد
اے مانعِ آفاق مبارک باشد
ہر سمت رواں دواں ہیں بھوکوں کے جلوس
اے حضرت رزاق مبارک باشد

یا

کافر ہیں یہ بھوکے یہ بھکاری انساں
لولے لنگڑے اداس اندھے بے جاں
نارِ دوزخ کے مستحق ہیں واللہ
یہ رحمتِ یزداں کے مکذب شیطاں

یا

مومن ہیں تو بھوکوں کو سزا دیں، آؤ
قبروں کی انہیں خاک چٹا دیں ، آؤ
یہ وعدۂ رزاق کا اڑاتے ہیں مذاق
ان فاقہ کشوں کا سر اڑا دیں ، آؤ

حادی ہے ازل سے راحت رب ودود
ہوتا ہی نہیں غرفۂ رحمت مسدود
کفار نے اک ڈھونگ رچا رکھا ہے
واللہ کہ فاقے سے نہیں یہ مردود

یا

رخسار پہ ہے بھوک کی زردی چھائی
آنکھوں میں تری ہے اور تری پہ پرکائی
اے کاسہ بدست و ننگ بروش گدا
کیا تجھ سے بھی ہے رزق کا پیماں بھائی

یا

گستاخ ہیں یہ کھنڈر گرا دو ان کو
یہ عرش پہ خندہ زن ہیں ڈھا دو ان کو
خود صاحب کرسی پہ ہیں اک طنز جلی
یہ جھونپڑیاں ۔ ارے جلا دو ان کو

انسان کی دکھ درد کی طویل راتیں ان کے احساسات میں شعلے بھڑکا دیتی ہے ۔
درد سے بوجھل قلم خون دل میں ڈوب جاتا ہے ۔ خدا سے پھر وہ یوں شکوہ سنج ہوتے ہیں

دن ہوتے نہ زرد رو نہ راتیں ہی سیاہ
بھولے سے بھی اک لب پہ نہ آتی کبھی آہ
انسان کے دل کو چھو نہ سکتے آلام
میرا اسا اگر شفیق ہوتا اللہ

آہنی عقل و استدلال ٹھوس انداز میں یوں سوچتا ہے۔

صحیفے بغل میں دبا کر نہ آ | تفلسف کی شمعیں بجھا کر نہ آ
روایت سے دل کی نہ تسخیر کر | درایت کے منبر سے تقریر کر
جنوں جذب وجدان ذوقِ لمن | سراسر فسوں کاریٔ اہرمن
"ازل کا تبسم" ابد کا جمال | فریبِ روایات وہم و خیال

مذہب کی رو سے زمان و مکاں کی پنہائیوں میں انسان کا مقام کیا ہے؟ آیا وہ اپنے ارادے کے تحت زندگی گذارنے کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں؟ اُس کا ہر عمل جبر مشیت کا پابند ہے؟ یا وہ اختیار کامل رکھتا ہے۔ انسان کی عظمت کے حوالے سے تمام مفکرین نے اس پہلو پر نگاہ ڈالی ہے۔ غالب و اقبال نے جیسا کہ کہا گیا اس رخ کو اپنے زاویہ سے سمیٹا ہے جوشؔ غالب کے پیرو ہیں۔ مذہبی اصطلاحات سے وہ گریزاں ہیں۔ "سیل و سلاسل" کی رباعیات اور "عرش و فرش" کی نظموں میں مختلف انداز سے مذہب کے حوالے سے عصر حاضر کی دانش کو خوبصورت طریقے پر سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور مذہب، خدا، کائنات کے متعلق سوچنے کی نئی راہ دکھائی ہے

ولی و قطب و امام و پیمبر واللہ
ترے بھی کھیل ہیں کیا کیا تخیلِ بشری

خدا کو وہ صرف انسان کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔

جب نوعِ بشر ہے میرا ایماں
ہر چہرۂ زشت و خوب میرا قرآں
اللہ کو آغوش میں پا لیا ہے میں نے
جیسے ہی مری گود میں آیا انساں

ہر سانس میں کوثر کے پیام آتے ہیں
ہر گام پہ حوروں کے خیام آتے ہیں
بندوں سے جو اک بار ملتا ہوں گلے
اللہ کے سو بار سلام آتے ہیں

غلط کہ بارشِ رحمت ہے کارسازِ معاش
جبینِ اہلِ عمل کا پسینہ ہے رزاق

مذاق بندگیٔ عصرِ نو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

اے مردِ خدا نفس کو اپنے پہچان
انسان یقین ہے اور اللہ گمان
میری بیعت کے واسطے ہاتھ بڑھا
پڑھ کلمۂ لا الٰہ الا انسان

جوشؔ کے نزدیک انسانی ذہن کی تھکاوٹ نے مذہب کی پناہ گاہیں تراشی ہیں۔ اور یہی تھکاوٹ منزل کو متعین کرتی ہے۔ اس لئے وہ کسی مذہبی اصطلاح کو استعمال نہیں کرتے۔ جوشؔ کے نقطۂ نظر سے اخلاقی قدریں دراصل معاشرتی ضروریات ہیں۔ اس کا تعلق خود ساختہ خدا سے نہیں ہے " ذاکر " " مولوی " جیسے ادارے ان کی تنقید کا اسی وجہ سے نشانہ بنتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب فکری جمود کے آئینہ دار ہیں اور ایک خاص طبقے کے مفاد کے نگراں ہیں اور یہ طبقہ عام انسانوں کو ایک نفسیاتی غلامی میں جکڑے ہوئے ہے جو مذہب کے نام پر

قائم کیا گیا ہے۔ وہ انسان کو اس نفسیاتی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اور اس لئے وہ ہر اس سوتے پر وار کرتے ہیں جہاں یہ قدریں تحفظ پاتی ہیں۔ مذاہب نے انسانوں کو مختلف متحارب گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جس کی سرپرستی بالائی طبقہ ہر دور میں کرتا رہا ہے۔ مذہبی عقائد کو بہ سرعت آتش گیر مادے میں تبدیل کر دینا بالائی طاقتوں اور ان کے پالے ہوئے مولویوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تاکہ انسانوں کی صفوں میں اتحاد باقی نہ رہے۔

ما بینِ شککان دار باب لقیں
وہ خون خرابے ہیں کہ رنگیں ہے زمیں
لیکن جس ذات پر بپا ہے یہ فساد
وہ کیا ہے؟ خود ان کو بھی یہ معلوم نہیں

اس لئے جوش کا صرف ایک ہی مذہب ہے جو آفاقی ہے۔ بین الاسلامی نہیں بلکہ بین الانسانی

انسان کی توحید کا مشتاق ہوں میں
شمع حبِ عمیم کا طاق ہوں میں
مشرق کا ہوں پابند نہ مغرب کا اسیر
انسان ہوں بندۂ آفاق ہوں میں

حضرت جوش بیسویں صدی کے "مذہب" کے ترجمان ہیں۔ انہوں نے عصر حاضر کی فکر سے اپنی دانش کو باندھا۔ وہ کائنات میں ایک توانائی مطلق میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ توانائی جو خیر کثیر ہے۔ "خدا" معاشرتی ضرورت کی پیداوار ہے۔ اس طرح انکی فکر اپنے آہنی استدلال سے جدید عہد کے ترقی پسند اور حیات بخش تصورات۔ بروایوں سے ہم آہنگ ہے۔ جو استقامت و استواری اور جوش و جذبے اور عقلی پختگی کے ساتھ ادبی روایت

میں، در آیا ہے۔ جذبہ بوکھرا ہے۔ عقل جو پختہ ہے۔ جسے منافقت کی ہوا نہیں لگی۔ جو سرآن چول 'حرف حق بلند شود داری شود' کی منزل پر ہے۔

فتوی فروشی کی روایت ہماری میراث ہے۔ حکمراں طبقے نے ہر زمانے میں اپنے ناجائز اقتدار کو دائمی شکل بخشنے کے لیے فتوی فروشوں کا ایک گروہ تیار کیا۔ ان کی قوت احساس کو سلب کرنے کے لئے انہیں توڑے نذر کیے۔ جتنا ہی توڑوں کا وزن بڑھتا گیا اتنی ہی گردنیں جھکتی گئیں۔ فتویٰ حاصل کرنا آسان ہوتا گیا۔ چنانچہ رسولؐ کے نواسے حسینؓ کے قتل کے فرمان پر قاضی شریح کا فتوی درج ہے۔ منصور حلاج، سرمد، شیخ محی الدین عربی، امام تیمیہ، ابن رشد ''ظل اللہ'' کو خوش کرنے کی خاطر فقیہان شہر کے ہاتھوں قتل گاہ پر چڑھتے رہے قائداعظم محمد علی جناح بھی کفر کے فتوی سے بچ نہیں سکے۔ ڈاکٹر اقبال کے خلاف مولانا دیدار شاہ کا فتوی کفر ''حیات اقبال جلد دوئم میں درج'' ہے۔ یہ سب منکران اسلام تھے لیکن کفر و الحاد کے رسول کہلائے۔

حضرت جوشؔ عظیم المرتبت ہستی ہونے کے ناطے اس کفر و الحاد کے فتوی سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ حالانکہ وہ اقبال کی طرح منکر اسلام نہیں تھے۔ اور نہ ہی انہوں نے اس کا کہیں دعویٰ کیا لیکن پھر بھی شرعی عدالت نے کفر و الحاد کے خصوصی تمغات انہیں ایک مرتبہ نہیں بار بار عطا کئے۔ تعجب کا مقام بھی نہیں کیونکہ ٹھیکیداری، خواہ مذہبی ہو یا سیاسی جس وقت توڑی جائے گی وہ تلملا کر چراغ پر پتھر ضرور برسائے گا۔ یہ چراغ کے مٹیل پر منحصر ہے کہ وہ سنگساری سے ٹوٹ جاتا ہے یا صرصر و سموم سے روغن غذا حاصل کرتا ہے اور جھلملانے کا نام نہیں لیتا۔

ابن خلدون نے ایک مقام پر لکھا کہ ''جب سے مسلمانوں نے عقلیت پسندی سے دست کشی اختیار کی رو بہ زوال ہیں۔'' حضرت جوشؔ کی مجبوری عقل پرستی اور حق گوئی تھی جسے وہ سیاست ہو یا مذہب کبھی بھی نیام میں نہ رکھ سکے۔ ''؛ ''روشنی طبع تو کی منزل سے ہمیشہ دوچار

رہے ۔ طنز و تشنیع کے تیر اور کفر و الحاد کے فتوؤں کی توجیہ انہوں نے اس طرح کی ۔

" میں اپنی قوم کا ایک معتوب ، مغضوب انسان ہوں ۔ میری قوم کے نزدیک مجھ میں بدترین عیب یہ ہے کہ میں اقوال و اساطیر ، روایات ، ومفلوظات ، کلیات مسلمات ، اور ایقان و اعتقاد کو محکم دلائل کی کسوٹی پر کسے بغیر قبول نہیں کرتا ، تشکک کو عرفان و حقائق کی کنجی سمجھتا ہوں ۔ تقلید پر اجتہاد کو فوقیت دیتا ہوں ۔ بے سمجھے بوجھے ایمان پر سمجھے بوجھے کفر کو ترجیح دیتا ہوں ۔ اور حق کے اظہار و اعلان میں اس بلا کا جری واقع ہوا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی دبنے کا تصور نہیں کر سکتا ۔ "

جس کی انہیں یوں سزا ملی ۔

بگڑ کر کفر کا فتویٰ لگایا
کمر میرے تجسس کی جھکا دی
گلا میرے تفکر کا دبایا
مرے افکار پر کی سنگ باری
اور اتنی کوئی چھل رہنے نہ پایا
بہ زعم خویش فہموں نے اکثر
مری تذلیل کی مجھ کو جھکایا
پڑیں وہ وقت کی ضربیں مسلسل
کہ عشق اپنے لہو میں خود نہایا
جو طاقِ خال و خد میں جل رہے تھے
تہہ جلد ان چراغوں کو بجھایا

حضرت جوش کی عقل کی عظمت اور انقلابی بصیرت یہ ہے کہ جہل افزا اور خیر بیزار ماحول میں انہوں نے ادراک کی پوری قوت کے ساتھ انسان کو راہِ حق دکھائی اور ضمیرِ انسانی کی عدالت میں کھڑے ہو کر وہ ببانگ دہل یہ کہتے رہے کہ سچائی کی جستجو میں میں نے کوتاہی نہیں کی۔

یورپ میں صنعتی انقلاب نے جاگیر داری نظام کے پرخچے اڑا دیئے۔ ہر سطح پر ذہن آزاد ہوا ــــــ Divine Right Theory کی جڑ دین سے اکھاڑ دی گئی لیکن مشرق خصوصاً ہندوستان ابھی جاگیر داری کے تلے کرب میں مبتلا تھے۔ اردو ادب جاگیر داری دورِ انحطاط کی پیداوار ہے ــــــ سماجی انقلاب کیسے ہوتا ہے؟ فرسودہ اقدار کیسے ٹوٹتی ہیں؟ اس پر اس وقت سوچنا ممکن نہیں تھا ــــــ بس حال سے بے اطمینانی کی کیفیت ہر شخص پر طاری تھی۔ ہاتھ زمین سے جڑنے کے بجائے اوپر دعا کے لئے اٹھے ہوئے تھے ــــــ اقتصادی بدحالی اور مذہبی افراتفری کا نتیجہ مختلف صورتوں میں ادب میں بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ ہمارے بیشتر شعراء اس عہد کے ماورائی تصورات سے متاثر تھے۔ جنت و دوزخ، عذاب و ثواب، بے ثباتی دنیا ہر شاعر و ادیب کا کسی نہ کسی عنوان موضوع تھا ــــــ غالب جیسا عظیم المرتبت شاعر۔ امید جس کا طرۂ امتیاز اور سماجی حقیقت پسندی جس کا نشان تھی۔ وہ بھی مذہبی تصورات سے آزاد ہونے کے باوجود پوری طرح اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکا۔ اس لئے کہ ادیب کا اپنے عہد سے باہر سانس لینا ممکن نہیں۔ غالب کے یہاں دو متضاد خط ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گذرتے ہیں۔ شعورِ ذات، شعورِ فن، رجعت ترقی، مجتہدی و مقلدی، قنوطیت و رجائیت ــــــ معلوم نہیں فنی اصطلاح میں اسے نادرہ کاری کہا جائے گا۔ یا فسوں کاری، شاہدِ واقعات کا مشاہدہ یا عارفِ باصفا کا عرفانِ نفس۔ کہ جس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ لکھ دیا۔ آخر ہر بات میں ترتیب و ہم آہنگی کیوں؟ جب چاہا خدا کو اپنا لیا۔ جب چاہا مذہب و روایات سے بغاوت کر دی؟ ــــــ لیکن اگر ایسا ہے تو غالب کی عظمت کا دار و مدار کس چیز پر ہو گا؟ ــــــ

غالب کی عظمت اس لئے تسلیم کہ اسے سب عظیم کہتے ہیں۔ لیکن زمانے کے اس اصول کے سامنے سر جھکانے کے بعد بھی غالب کی عظمت مجروح ہوتی ہے ـــــ کیا اسی پہلو پر غالب کی عظمت فن محفوظ ہے، اور اگر ایسا ہے تو پھر اس کے فکر و فن کے تانے بانے کس چیز سے تیار ہوتے ہیں؟ وہ کون سا مواد تھا جو ان کے کام آتا تھا؟ **فن میں فکر، فکر میں گہرائی، گہرائی میں سوز اور سوز میں ساز کی کیفیت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟** ــــــ

کیا اجتماع ضدین زمانے کا مزاج تھا؟ یا غالب کا اپنا مزاج؟ اگر دوسری بات سچ ہے تو پھر اس بنیادی مزاج کے عناصر تلاش کرنا پڑیں گے۔ روایت پرستی یا تشکیک؟ تقلید یا اجتہاد؟

اگر اسلوب کسی فنکار کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے تو غالب کے مطالعے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مرزا فطرتاً **تشکک اور ہر قدم پر تشکیک کا شکار تھے** ــــ اپنی قندیل صفت عقل کی روشنی میں دنیا کی حقیقتوں کو جامد ماننے کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔ حقیقتیں ان کے سامنے سوالیہ نشان بن کر آتی تھیں۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے۔

یا

آئندہ و گذشتہ تمنائے حسرت است
یک حرف "لا" بود کہ بہ ہر جا نوشتہ رند

'لا' اور 'الا' زندگی کی تخریب و تعمیر تدوین تنظیم کا اشاریہ ہوتے ہوئے بھی زمانے کی دست برد سے بے نیاز نہیں ــــ 'لا' سے 'الا' تک پہنچنے کی منزل، لیقین، نہیں تشکیک ہی سے شروع آتی ہے۔ تشکیک کی دنیا میں پہنچ کر انسان بے راہ رو بھی ہو سکتا ہے۔ اگر اس میں علمی تبحر، تجزیہ نفس، تعقل و تفکر اور درک و

ادراک کی حقیقی صلاحیت موجود نہ ہو۔ غالب کے ادراک کا حسن تاریخ کی دھار پر تیز ہوا۔ اس لئے وہ جبری نہیں قدری ہیں۔ قدری کو اپنے اختیار تمیزی پر اعتبار ہوتا ہے۔ جرأت فکر اور جرأت عمل تشکیک و تادیب کے روشن پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

یا

سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنا شبستاں سمجھا

یعنی تھک کر بیٹھ جانا ہی منزل قرار پاتا ہے۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دردِ یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ان کے اس میلان طبع کے ساتھ دوسری بات جو انہیں "جبریت" اور عدمیت یعنی Nihilism کی طرف جانے سے روک رہی تھی وہ ان کا عقیدہ وحدت الوجود تھا جو تشکیک کے راستے سے نکھر کر آیا تھا۔ غالب ہمہ اوست کے قائل تھے۔

لاموجود الا اللہ ۔ موثر فی الوجود الا اللہ

ہمہ اوست کے اس نظریئے نے ان میں بالغ نظری پیدا کی۔ مِلتیں مٹ کر اجزائے ایمان کی منزل پر آگئیں ۔ انفرادی نقطۂ نگاہ اجتماعی شعور میں ڈھل گیا۔ اور انہیں کائنات میں توانائی مطلق کارفرما نظر آنے لگی۔

رسولؐ تاریخ انسانیت میں انسانی ارتقا کی طرح ناپیداکنار رہے۔ ان کا ہر حرف اور ہر عمل جہل و تاریکی کے تپتے ریگزار میں چشمۂ آبِ حیواں ہے وہ نطق انسان کا زریں جھومر ہیں جس نے جلجلاتی اور آگ برساتی ہوئی دھوپ کو چاندنی میں ڈھال دیا۔ 'گدائے راہ' کو شکوہ قیصری بخش دی۔ جھلسے ہوئے انسان کو آبِ حیات عطا کی، جہل وتاریکی اور زرگری کی زنجیریں پہنے ہوئے انسان کو آزادی دیدی۔

حضرت جوشؔ کی رسول مقبولؐ سے والہانہ محبت اور عقیدت روایتی مذہب کے حوالے سے نہیں بلکہ وہ انکی آفاقی فکر کے سامنے سجدہ ریز ہیں جو مظلوموں، محکوموں اور مجبور انسانوں کے حوالے سے ہے۔ وہ رسول کریمؐ کو "ڈاکیہ" نہیں سمجھتے۔

پیشِ اہلِ جلال و اربابِ جمال
خود فطرتِ انبیاء ہے بنیادِ کمال
اور شیخ کے نزدیک ہے ہر ایک نبی
اللہ کا ڈاکیہ اور ازل کا دلال

جوشؔ صاحب انہیں عقل وعلم، بصیرت وبصارت کا ایک ایسا ہمالہ پہاڑ تصور کرتے ہیں جس کی سرفرازی پہ بے بصیرت انسان لاکھ پتھر برسائیں لیکن اس کے خال وخط ہمیشہ لو دیتے اور اس کا نقش ہمیشہ گلزارِ ارم بنا رہے گا۔

نوعِ انساں کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام — مردِ غازی کا کفن ہے، خلعتِ عمرِ دوام
نصب کس نے کر دیئے مقتل میں حوروں کے خیام — جانتے ہو اس دبیرِ ذہنِ انسانی کا نام

جو انوکھی فکر تھا، جو اک نیا پیغام تھا
اس حکیم نکتہ سرور کا محمدؐ نام تھا

اے محمدؐ، اے سوارِ توسنِ وقتِ رواں
اے محمدؐ، اے طبیبِ فطرت و نبّاضِ جاں

اے محمدؐ، اے فقیہِ نفس و نقادِ جہاں
موت کو، تو نے وہ بخشی آب و تابِ جاوداں

زندگانی کے پجاری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغامِ اجل کی آرزو کرنے لگے

خلق کو، تو نے، تمنائے شہادت بخش دی
اس تمنائے شہادت نے شجاعت بخش دی

پھر شجاعت نے بھٹکنے کی حرارت بخش دی
اس حرارت نے گداؤں کو حکومت بخش دی

اس قدر عجلت سے تو روئے زمیں پر چھا گیا
مدعی چکرا گئے، تاریخ کو غش آ گیا

سب سے پہلے دہر کو تو نے ہی سمجھائی یہ بات
طاقِ ایوانِ شہادت میں ہے قندیلِ حیات

سرفروشی ہے متاعِ زندگانی کی زکوٰۃ
موجِ کوثر کی سخا کا پیک ہے، نخلِ فرات

عرش اتر آتا ہے فرشِ گرم گرد دار پر
رقص کرتی ہے دوامی زندگی تلوار پر

آتشِ سوزاں کو تو نے آبِ زمزم کر دیا
وحشیوں کو حاملِ تہذیب محکم کر دیا

خاک کو نسریں بنایا جام کو جم کر دیا
سرخ شعلوں کو نچوڑا موجۂ یم کر دیا

کشتیاں چلوائیں طوفاں سے ترے فرمان پر
موت لوئی زندگی کاٹی ترے قرآن پر

موت کی ظلمت میں تو نے جگمگا دی زندگی
جوہرِ شمشیرِ عریاں میں دکھا دی زندگی

شمع کے مانند قبروں میں جلا دی زندگی
سرزمینِ مرگ میں تو نے اگا دی زندگی

حبس ٹوٹا باغِ جنت کی ہوا آنے لگی
مقبروں سے دل دھڑکنے کی صدا آنے لگی۔

خاک کے ذرات کو تو نے ثریّا کر دیا — آگ کو پانی کیا پانی کو صہبا کر دیا
موت سی کالی بلا کو رشکِ سلمیٰ کر دیا — آخری ہچکی کو گلِ بانگِ مسیحا کر دیا

سر سے خوفِ نیستی کی یوں بلائیں ٹال دیں
آدمی نے موت کی گردن میں باہیں ڈال دیں

حضرت علی تاریخِ انسانیت کی وہ عظیم المرتبت شخصیت ہیں جن کا ہر لفظ حقائق آلشار معارف افروز، جہل بیزار اور ہر عمل شر مسمار، استقامت کی معجزہ سامانی لئے اور پائے فقر پر سلطان کی سجدہ ریزی ہے۔ ان کی پوری زندگی زمین کے سینے سے لگ کر چلی اس لئے اس میں رسولِ مقبول کی طرح سوندھی خوشبو ہے جو ناتراشیدہ آرزوں کو دلنواز تبسم میں ڈھالتی ہے، فصلِ خزاں کو فصلِ زمستاں بناتی ہے اور نارسیدہ امنگوں کے مکھڑے پر تبسم کی پھوار بن جاتی ہے۔ علی رات کی مانگ میں تاروں کی سنہری افشاں بھرتے ہیں اس لئے جوش صاحب حضرت علی کی زعفرانِ فکر کے حضور یوں نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

لو ہمیں، فرازِ روح پر ابھرا اک آفتاب — دیں کا نشاں، خرد کا عَلَم، آگہی کا باب
حق ساز و حق نواز و حق آواز و حق مآب — مقصودِ عرش، مورثِ افلاک، بُوتراب

عرفانِ زندگی کا عَلَم کھولتا ہوا
بندِ قبائے لوح و قلم کھولتا ہوا

پیدا ہوا سرودِ ازل سلسبیل میں — اتری شعاع، سینۂ فکرِ جمیل میں
روشن ہوئے چراغ دیارِ خلیل میں — جنبش ہوئی دوبارہ پرِ جبرئیل میں

چھلکی شعاع، تفکر کے باب سے
پھوٹی کرن، جبینِ رسالت مآبؐ سے

نکھرا ادب، خیال کو حاصل ہوئی زباں — دمکی جبینِ حرف پہ معنیٰ کی کہکشاں

چھلکیں شرابِ نغمۂ حق کی گلابیاں — داؤد ویت نے پیش کیا تاجِ زرفشاں

یوسف بڑھے جمالِ فراواں لئے ہوئے

پریاں در آئیں، تختِ سلیماں لئے ہوئے

لفظوں کی موج رنگ میں غلطاں ہوئے گہر — لہجے کی آب جو میں چلی کشتیٔ قمر

نوکِ قلم سے علم کی، طالع ہوئی سحر — اور پھر سحر کی چھوٹ پڑی ذوالفقار پر

بالائے ذوالفقار، عَلم جگمگا اُٹھا

اور ضو فشاں عَلم پہ قلم جگمگا اُٹھا

گھومی کلیدِ فضل، کھلا قفلِ فیضِ عام — ناگاہ آسمان پہ گونجا زمیں کا نام

گردش میں آئے نعرۂ صلِّ علیٰ کے جام — پڑھتے ہوئے درود، بڑھے انبیاء تمام

کعبے کے گرد ایک کرن گھومنے لگی

روحِ محمدؐ عربی جھومنے لگی

شب نے اپنی وآں میں ہوئی صبح منجلی — بادِ مراد، ناز سے، مچلی گلی گلی

عرفان کائنات کی چٹکی کلی کلی — اور روحِ ارتقا نے پکارا کہ "اے علیؑ"

"لے یہ کلیدِ علم، یہ گیتی کا باب ہے

اس خاک کو ابھار کہ تو بوتراب ہے

"اُٹھ اور جلا چراغِ، سرِ سبزِ آب و گِل" — "لا خشکیوں کو کھینچ کے چشموں کے متصل"

"چونکا انہیں جو خاک سے ارماں ہیں منفعل" — "سینے میں اس زمیں کے دھڑکتا نہیں ہے، دل

"ڈوبی ہوئی ہے نبض جہانِ علیل کی"

"پیدا کر اس جمود میں رَو سلسبیل کی"

"دنیا کو تو، بتائے گا یہ نکتہ جمیل" "یعنی ازل سے ایک توانائی جلیل"
"جس کی کوئی نظیر نہ جس کا کوئی عدیل" "اس کار گاہِ وقت گریزاں کی ہے کفیل"

"اظلال و انجذاب نہ وہ انعکاس ہے"

"دنیا سے دور ہے نہ وہ دنیا کے پاس ہے"

"انسان کے مزاج کی اس میں نہیں ہے بو" "وہ کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے سوائے ہو"
"وہ شاہِ نرم طبع، نہ سلطانِ تند خو" "وہ دل نواز دوست، نہ ہمت شکن عدو"

"وہ پائے بندِ رسم وفا و جفا نہیں"

"جذبات جس پہ ٹوٹ پڑیں وہ خدا نہیں"

"ہاں، دن کو، تو کریگا سیہ رات سے جدا!" "وزنی حقیقتوں کو روایات سے جدا"
"اللہ کو تمام قیاسات سے جدا" "اسمار و وصف و سمت و اشارات سے جدا"

"داغوں سے تو احد کے ورق کو بچائے گا"

"شخصی تعینات سے حق کو بچائے گا"

"یہ کھے گا تیرا علم ہی اس کائنات کو" "جانچے گی تیری عقل ہی خونِ حیات کو"
"وہ تو ہے جو کھرچ کے نقوشِ صفات کو" "دیکھے گا اک حکیم کے مانند ذات کو"

"بے حد کو حبس خانۂ حد سے چھڑائے گا"

"تو کبریا کو دامِ عدد سے چھڑائے گا"

"آب مکاں، امام زماں، آیۂ مبیں" "کنز علوم کاشف سر، کعبۂ یقیں"
"قاضیٔ دہر، قبلۂ دوراں، قوام دیں" "منشائے عصر، معنیٔ کن، میر عالمیں"

"تا بندگی، طرۂ طرفِ کلاہِ علم"

"مولائے جاں، رسولِ تمدن، الٰہِ علم"

"اے صدق کے محیط، حقائق کے آبشار" "اے حق کے بادشاہ، معارف کے تاجدار"
"اے علم کے خدیو، تفکر کے شہریار" "نوعِ بشر کو فکر و عمل کی طرف پکار"
"ہاں، صبح زندگی کی شفق ہے ترا وجود"
"ایفائے عہد رحمتِ حق ہے ترا وجود"

نواسۂ رسول حسین ابن علی وہ عہد ساز اور تاریخ ساز ہستی ہے جس نے اپنی ناتوانی سے توانائی کی کلائی مروڑ دی۔ جھلاتی دھوپ کو چاندنی، جھکڑوں کو بادِ صبا فکر و عمل کو ثمر دار درخت اور انسان کو تاج مہتاب بنا دیا ــــ تاریخ میں جس مقام پر بھی حق و باطل کا رن پڑے گا اور انسان سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق پڑھتا ہوا انکار، کی منزل پر آئے گا زر و جواہر کے نیچے دبی ہوئی سلب شدہ قوتِ احساس کو واپس لے گا اور کچلی ہوئی جراتِ اظہار کو چھینے گا اس وقت حسین کی زریں پیشانی پر فاتحانہ تبسم بکھر جائے گا۔ کیونکہ انسان کی بزرگی بھی تو ہے کہ اس کی آگہی صحرائے حیات کو خورشید سحر بنا دے اپنے عہد کی دانش میں بصیرت کے چراغ جلا دے۔ اور پھر چراغ سے چراغ جل اٹھیں اور زندگی حسین کا عزمِ جواں بن جائے۔

جوش کے نزدیک

حسین کی قندیلِ صفت فکر پہ سر نیاز خم کرنا۔ طواف کعبۂ انقلاب افروز عمل کو موتیوں کا لباس عطا کرنا جہادِ اکبر ہے۔ حسین کے فکر و عمل کے سامنے جوش صاحب کا قلم فن کے تمام لوازمات کو لئے، یوں رقصاں ہے۔

کربلا آج بھی ہے ایک لگاتار پکار ہے کوئی پیروِ ابن علی ہو تیار
عصرِ حاضر میں یزیدوں کا نہیں کوئی شمار تم مصلّوں پہ دو زانو ہو، مسلّح اشرار
شورِ ماتم میں کہیں تیغ کی جھنکار نہیں
لب پہ نالے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں

کربلا میں اثرِ باغِ جناں آج بھی ہے   بوئے انفاسِ مسیحا نفساں آج بھی ہے
حسنِ رنگینیِ خونیں کفناں آج بھی ہے   صبح عاشور کی گل بانگِ اذاں آج بھی ہے
اک پُر اسرار خموشی ہے پُر افشاں اب تک
صبح کے دوش پہ ہے شامِ غریباں اب تک

اب بھی گو دھوپ کی شدت سے زمیں بھنتی ہے   سوزنِ خاک شراروں کی ردا بنتی ہے
پھر بھی ذروں سے ہوا لعل و گہر چنتی ہے   زندگی سیرتِ شبیرؑ پہ سر دھنتی ہے
رنگِ رخسارۂ تاریخ نکھر جاتا ہے
لب پہ جب نام حسینؑ ابنِ علیؑ آتا ہے

کربلا اب بھی سرِ وقت پہ لہراتی ہے   زلف کی طرح خیالات پہ بل کھاتی ہے
خامشی رات کو جس وقت کہ چھا جاتی ہے   دلِ زینبؑ کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کبھی ظلمت میں جو کوندا سا لپک جاتا ہے
ایک قرآن بلندی پہ نظر آتا ہے

کربلا اب بھی حکومت کو نگل سکتی ہے   کربلا تخت کو تلووں سے مسل سکتی ہے
کربلا، خار تو کیا، آگ پہ چل سکتی ہے   کربلا وقت کے دھارے کو بدل سکتی ہے
کربلا قلعۂ فولاد ہے جراروں کا
کربلا نام ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

رباعیات

اردو زبان فارسی سے یوں جڑی ہوئی ہے جیسے کرن سورج سے یا موج سمندر سے۔ عجمی اثرات اردو شاعری و ادب کے فکری تانے بانے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ رباعی فارسی نژاد صنف سخن ہے۔ جسے قدیم ایران میں چہار بیتی اور جفتی بھی کہا جاتا تھا۔ نجم الغنی مصنف بحر الفصاحت نے اس کی ۸۲۹۴۴ شکلیں بتائی ہیں۔ غالب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "رباعی کے اوزان بعض کے نزدیک ۱۸ اور بعض کی رائے کے مطابق ۲۴ ہو سکتے ہیں۔ نکات غالب صد ۲۸ مرتبہ نظامی بدایونی

اکثر نقاد جوش صاحب کی نظموں کی طوالت اور الفاظ کے تکرار پر معترض ہیں۔ لیکن انکی فکر کی جولانی اور قلم کی روانی جس وقت رباعی کے میدان میں قدم رکھتی ہے تو ایجاز و اختصار کے کنول کھل اٹھتے ہیں۔ فن کا چاند پوری آب و تاب سے نکل آتا ہے۔ چاندنی کی ٹھنڈک میں شعر کی ڈالی مسکرا اٹھتی ہے۔ اور کورے گھڑے کے پانی کی خوشبو ادب کے چمن میں بکھر جاتی ہے۔ رباعی فکری ذہنی اعتبار سے "قلاو دلا" کی معراج پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں خمریات کے قائد اعظم، عمر خیام کے بھی قدم برابری نہیں کر پاتے۔

فارسی شاعری میں عمر خیام خرابات کی انگنائی میں ترچھی بوچھار، سبزہ زار میں گنگناتا، گاتا، جھومتا جھرنا اور آنسوؤں کے دائروں میں بے بہا موتیوں کی دکان ہے۔ جس نے حسن کے ہر لب کو چکھا ہے۔ خمار کے ہر پہلو کی چہکار رسنی ہے۔

رباعیات میں جوش کا کینوس اتنا وسیع، عریض اور عمیق ہے کہ اس کو گرفت میں کرنا معمولی بات نہیں۔ یہاں ایک عجیب آنکھ اور "دیدہ بینا" سامنے آتی ہے جو کیمرہ کی طرح دور اور نزدیک کے لینز لگا کر ہر شے کا احاطہ کرتی ہے لیکن یہ آنکھ محض عکاس نہیں بلکہ نقاد بھی ہے تیز رفتار دنیا کی شناسا ہی نہیں بلکہ اس کے ذوق کی تربیت کی نگراں بھی ہے۔ اختصار،

اور حجابیت۔ ذکاوت اور ہوشمندی لئے ہر رباعی ڈرامے کا سین بھی پیش کرتی ہے۔ عقل پرستی کی مضبوط گرفت انہیں رباعی کے میدان میں صرف فن نہیں بلکہ فکر کی بھی اعلیٰ سطح پر کھڑا کر دیتی ہے۔ مفکر کی حیثیت سے انکی "نگاہ" کو پانے کے لئے رباعیات سنگ میل کی درجہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے رباعی کو فنی اور فکری دونوں زاویوں سے منفرد انداز بخشا۔ یہ رباعیاں زندگی کا آئینہ خانہ ہیں جس میں ہر چہرہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے مکالموں میں بھی رباعیاں لکھی ہیں جس سے انتہائی خوبصورت تحیّر کا جذبہ چوتھے مصرعے سے پیدا کیا ہے۔ اردو شاعری کے پورے سرمائے میں جوش صاحب کے مقابلے میں کسی بھی شاعر نے اتنی حسین نادر خوبصورت اچھوتی اور تازہ تشبیہات استعارے اور images استعمال نہیں کیں۔ جوش صاحب نے اکثر حسیات اور کیفیات سے تشبیہیں دی ہیں۔

دوشیزۂ صبح نے بہوٹے جو ملے
لو پھٹ گئی، زرتار کرن پھوٹ گئی

یا

غنچوں کے یہ شیشے ہیں کہ سونے کے ڈلے
شبنم کے یہ قطرے ہیں کہ مندر کے چراغ

یا

گوکل میں چمک رہی ہیں گویا رادھا
یوں سرخ الاؤ میں ہے گاتی ہوئی آگ

یا

یوں پھوٹ رہا ہے رنگِ وادی جیسے
ململ کے ڈوپٹے سے جھلکتا جوبن

یا

جس ہنج سے چیر چیرائیں سوکھے پہیے
یوں ان کے رُندھے گلے میں گھومی آواز

یا

یوں بول مچل رہے ہیں تیرے لب پر
جیسے ریشم پہ بیل بوٹے کا تیں

یا

جب رات سے ہوتی ہے سحر بر سر جنگ
اٹھتی ہے دلِ تپاں میں یوں طرفہ امنگ
جلتے کاغذ کی لو کے آگے آگے
جیسے جلتا ہے ایک باریک سا رنگ

ملاحظہ ہو

غنچے تیری بے کسی پہ دل ہلتا ہے
صرف ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

یا

اس طرح یہ رباعی دیکھئے

کل رات گئے، عینِ طرب کے ہنگام
پر تو یہ پڑا پشت سے کس کا سرِ جام
"تم کون ہو؟" "جبریل ہوں"، کیوں آئے ہو
سرکار فلک کے نام کوئی پیغام

ڈرامے کے جتنے لوازمات ہیں وہ یہاں سب موجود ہیں۔ مکالمہ، وقت،

ماحول، فضا اور کلچر climate

موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے جوشؔ خیام سے بہت آگے ہیں۔ اردو شاعری میں فراقؔ صاحب یقیناً ان کے مدِ مقابل ٹھہرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ "جوشؔ صاحب کے ہمیشہ دل نکلا ہوا ہے۔" لیکن ان کے اور فراقؔ کے لہجے میں زیرِ غنائی" یعنی sub lyrical صفت میں یقیناً مماثلت ہے۔ رس اور لوچ کے امتزاج سے جذبات کی لطافت، حس کی شدت، اور الفاظ کا نگینہ نما جڑاؤ نغمگی میں ڈھل جاتا ہے۔ لہجے ہی میں شاعر کی شخصیت چھپی ہوتی ہے اس کا صحیح اظہار شاعری کو سحر کاری بنا دیتا ہے۔ درد بھری آواز کو نغمہ میں ڈھال دینا کہ وہ چیخ کے بجائے دکھ، درد، اور قوتِ شفا کی حامل ہو جائے اتنا بڑا کارنامہ ہے جہاں جبرئیل کے بھی پر جلتے ہیں۔ لہجے کی شیرینی، لطافت اور طہارت کا مزاج اور لے ہم آہنگی شگفتگی اور فریفتگی کے عالم میں یہ اشعار یوں ٹپکتے ہیں۔

کس ناز سے گلشن میں ٹہلتی ہوئی آئی
سانچے میں شگفتگی کے ڈھلتی ہوئی آئی
کلیوں کی گرہ کھل گئی جس دم وہ دمِ صبح
آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملتی ہوئی آئی

یا

الفاظ میں غلطیدہ ہے جادو گویا
آواز بدل رہی ہے پہلو گویا
لہجے کا ترے درد عیاذاً باللہ
لفظوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو گویا

یا

زلفوں کو ہٹا کے کسمسایا کوئی
فرشِ مخمل پہ رسمسایا کوئی
جیسے کندن پہ چاندنی کی لہریں
یوں چونک کے صبح مسکرایا کوئی

لہجے کا درد فراقؔ صاحب کے یہاں یوں جھلکتا ہے

وہ اک گہرا سکوت کل رات گئے — طاقوں پہ دیئے نیند میں ڈوبے ڈوبے
پلکیں جھپکا رہی تھیں جب ٹھنڈی ہوائیں — آنا ترا اک نرم اچانک پن سے

یا

جب تاروں بھری رات نے لی انگڑائی — نمناک مناظر نے پلک جھپکائی
جب چھاگئی پُر کیف اداسی ہر سمت — سرشار فضاؤں کو تری یاد آئی

جوش صاحب اور فراق صاحب کے لہجے میں تلاطم میں ٹھہراؤ ۔ نرمی میں مٹھاس اور زندگی میں سوز وگداز کے پردوں سے جو آواز نکلتی ہے اس آواز میں آفاقیت اور کائنات کا سوز جاگ اٹھتا ہے ۔ درجل نے کہا تھا

فراق صاحب کا شعر ہے

کفن ہے آنسوؤں کا دکھ کی ماری کائنات پر
حیات کیا انہیں حقیقتوں سے ہونا با خبر

جوش صاحب کا شعر ہے ۔

چل رہے ہیں زندگی پر چاندنی کے نیشتر
چبھ رہی ہے دل میں پُروائی کسے آواز دوں
اف خموشی کی یہ آہیں دل کو برماتی ہوئی
اف یہ سناٹے کی تنہائی کسے آواز دوں

یہاں لہجے کی حلاوت ،شیرینی ، اور مٹھاس آواز کے تال و سم کے درد میں نہائی ہوئی

کائنات کی روح جھنکار بن کر ابھرتی ہے۔

جوش اور فراق کے یہاں رباعیات میں جس وقت عشق کا ذکر چھڑتا ہے تو سمندر کوزے میں بند نظر آتا ہے۔ دونوں کے یہاں فضا کے حسین پس منظر میں عشق ابھرتا ہے۔ جو انفرادی ہوتے ہوئے مظاہر فطرت کے وجود بسیط میں ایک مشترک رشتے کا احساس دلاتا ہے۔ ان کے یہاں عشق، کائنات، فضا سانس لیتی اور دھڑکتی نظر آتی ہے۔ چار مصرعوں میں "ہزار شیوہ" حسن کو سمیٹ لینا۔ بے شمار خوشیوں کی خوشبو بکھیر دینا یہ عظمت شاعری کی وہ صفت ہے جسے ارسطو نے "بلند سنجیدگی" کا لقب دیا ہے۔ جوش صاحب کا انداز ملاحظہ کیجئے۔

فقروں کی یہ تازگی یہ لہجے کی بہار
قربان ترے اے نگارِ شیریں گفتار
اللہ رے کھنکتی ہوئی آواز تری
چینی پہ ہو جیسے اشرفی کی جھنکار

جوش صاحب کے سرمائے میں یہ رباعیات محض جزو کی قیمت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کی رباعیات بحرِ ذخار ہیں جس کی تھاہ پانا آسان نہیں۔

جن میں محبوب کی آمد پر ٹھنڈی "ہوا کی پلکیں جھپکنے لگتی ہیں۔" "دیئے نیند میں ڈوب جاتے" ہیں، زلفیں ظلمات کے مہکتے جنگل بن جاتے ہیں۔ انگڑائی اور معشوق کی رسیلی آنکھیں شگیت کی سرحدوں پر کھلنے والے پھولوں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ غرضیکہ ان رباعیوں میں ایک عجیب قسم کی جمالیاتی اور حسی کیفیت ہی منفرد انداز میں نہیں ابھرتی بلکہ وہ حسن و عشق، محبت، جنوں اور حیات کے الفاظ کو اشارتی مضموں میں بھی استعمال کرتے ہیں اور ایسے موقعوں پر ان کا لہجہ متفکرانہ ہوتا ہے جو عشق اور غم کے الفاظ "حیات گیتی سے for life ideal اور زندگی کی مرکزی اکتاہٹ کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے
اپنے کو فریبِ عشق دیتے دیتے
اف کارِ حیات تھک چکا ہوں مسعود
دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے

یا

کس ناز سے گلشن میں ٹہلتی ہوئی آئی
سانچے میں شگفتگی کے ڈھلتی ہوئی آئی
کلیوں کی گرہ کھل گئی جب، وہ دم صبح
آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملتی ہوئی آئی

یا

چونکا ہے کوئی نگار الہیٰ توبہ
رس میں ڈوبا خمار الہیٰ توبہ
سکتے میں ہیں بھیرویں کی تانیں گویا
ہونٹوں کا خفیف ابھار الہیٰ توبہ

یا

اللہ رے بدمست جوانی کا نکھار
ہر نقشِ قدم پر سجدہ کرتی ہے بہار
اس طرح وہ گامزن ہے فرش گل پر
پڑتی ہے ہری دوب پہ جسطرح پھوار

اس نوع کی سینکڑوں رباعیاں جوش صاحب کے مجموعائے کلام میں "حقائق"، "پیران سالوس"، "خمریات"، "مستغرقات" کے عنوانات کے تحت موجود ہیں۔

یہ چاند کا گھیرا ہے کہ تیرا مکھڑا
فردوس کا ڈیرہ ہے کہ تیرا مکھڑا
جنگل کی یہ راتیں ہیں کہ تیری زلفیں
پربت کا سویرا ہے کہ تیرا مکھڑا

یا

رقاصہ کی تانوں پہ تھرکتا ہے قمر
توڑا لیتی ہے تو برستا ہے گہر
ہلتا ہے جو اک بار تارِ گردن
سو بار لچکتی ہے دو عالم کی کمر

یا

مشرق کے ورق پر تھی سنہری تحریر
ظلمت میں تھرک رہی تھی نورس تنویر
اتنے میں جو سر پہ چہچہائے طائر
دیکھا کہ فضاء پر ہے تمہاری تصویر

یا

گو جہل کی کیچڑ میں سنے بیٹھے ہیں
پر مسندِ علم پر تنے بیٹھے ہیں
بدھو، بھوندو، بلاؤ، بوڑم، بونگڑ
بقراط کے استاد بنے بیٹھے ہیں

جوش صاحب نے اپنی شعری بساط کو داخلی جذبات و کیفیات سے آراستہ کیا ہے لیکن انہوں نے مختلف موضوعات کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور حسن و عشق کی نفسیات کو ذاتی تجربہ گاہ کی بھٹی میں کندن بنانے کی کوشش کی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ انکی آواز کی لے بن گئی ہے۔ ملاحظہ ہو

سانچے میں گھٹا کے ڈھل رہا ہے کوئی
پانی کے دھوئیں میں جل رہا ہے کوئی
گردوں پہ ادھر جھوم رہے ہیں بادل
سینے میں ادھر مچل رہا ہے کوئی

یا

اے حسن ٹھہر، آگ بھڑک جائے گی
صہبا تری ساغر سے چھلک جائے گی
مجھ کو تو یہ ڈر ہے کہ دلائی کیسی!
انگڑائی جو لی، جلد مسک جائے گی

یا

اے کعبۂ ذوقِ دید وائے دلبر نگاہ
اے رہزنِ انجم و غارت گر ماہ
کیا تیرہ شبی کا اس مسافر کو ہو خوف
تیرے چہرے کی لو ہے جس کے ہمراہ

یا

زلفوں کو ہٹا کے کسمسایا کوئی
فرشِ مخمل پہ رسمسایا کوئی

جیسے کندن پہ چاندنی کی لہریں
یوں چونک کے صبح مسکرایا کوئی

فراق صاحب کے مجموعہ کلام "روپ" کی تقریباً تمام رباعیاں جمالیاتی تجربے اور فضا کی تھرتھراہٹ لئے ہوئے سامنے آتی ہیں۔ ان کا محبوب خالص ہندوستانی ہے جس کی نس نس میں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔

پیکر ہے کہ چلتی ہوئی پچکاری ہے
فوارۂ انوارِ سحر جاری ہے
پڑتی ہے فضا میں سات رنگوں کی پھوار
آکاش نہا اٹھتا ہے۔ بلہاری ہے

یا

مشرق سے جوئے شیر بہنے لگی جب
کافور ہوئی دہر سے تاریکیٔ شب
اٹھا کوئی نیند سے سمیٹے ہوئے گیسو
اک نرم دمک لئے جبیں کا پورب

یا

جب پچھلے پہر پریم کی دنیا سولی
کلیوں کی گرہ پہلی کرن نے کھولی
جوبن رس چھلکاتی اٹھی چنچل نار
رادھا گوکل میں جیسے کھیلے ہولی

یہ نقرئی آواز یہ مترنم خواب
تاروں پہ پڑ رہی ہو جیسے مضراب
لہجے میں یہ کھنک یہ رس یہ جھنکار
چاندی کی گھنٹیوں کا بجنا تہہ آب

یہاں فراق صاحب جمالیاتی حس کو نہ جانے کتنے زاویوں سے دیکھتے اور دکھلتے ہیں۔ لطافت، دھیماپن، لہجے کی نغمگی ہندی گیتوں کا رس ہر لفظ میں گھول دینا فراق کا عظیم کا کارنامہ ہے۔ جس میں سوائے جوش صاحب کے اور کوئی دوسرا شریک نہیں۔

فراق صاحب قدیم ہندوستان کی روایات اور فلسفے سے بہت متاثر تھے۔ وہ اردو ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبان کے رسیا تھے۔ رموزِ حیات اور اسرارِ کائنات کی عقدہ کشائیاں کر کے وہ اپنے ایک ایک لفظ میں ہندوستانیت کی روح کو سمیٹے ہوئے تھے۔ بڑے شاعروں کی طرح ان کا لہجہ بھی منفرد ہے جہاں داخلی کیفیت جو دھوئیں کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ الفاظ کا روپ دھار لیتی ہے۔ انتہائی یاسیت، تشبیہی اور تمثیلی انداز میں گہرا غم اور اداسی یہ سب مل کر ان کے لہجے کی تعمیر کرتے ہیں۔ روز و شب کی گوناں گوں کیفیات کو اور حسن کی عشوہ طرازیوں کو ہندوستان کی خوشبو میں جس طرح انہوں نے دیکھا ہے غالباً اس میں جوش صاحب بھی باوجود اپنی ارضیت کے آگے قدم نہیں بڑھا پاتے۔

چڑھتی جمنا کا تیز ریلا ہے کہ زلف
بل کھاتا ہوا سیاہ کوندا ہے کہ زلف
گوکل کی اندھیری رات دیتی ہوئی لو
گھنشام کی بانسری کا لہرا ہے کہ زلف

یا

ہونٹوں میں وہ رس کہ جس پہ بھونرا منڈلائے
سانسوں کی وہ سیج جس پہ خوشبو سو جائے
چہرے کی دمک پہ جیسے شبنم کی ردا
مدھ آنکھوں کا، کام دیو کو بھی جو جھپکائے

فراق صاحب کی رباعیوں میں اس قسم کی ہزاروں مثالیں ہیں۔ گویا وہ کوشش کرتے ہیں کہ جمالیاتی احساسات میں یک جہتی پیدا کریں اور ایک ہی لمحے میں مختلف روپ دیکھ لیں اور اپنی نگاہوں کو حقیقت کی گہرائی تک پہنچا دیں۔ فراق صاحب کی رباعیات زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ وقت جیسے نازک مسئلہ کو جوش صاحب کی طرح ڈرامائی عنصر کے ساتھ یوں ادا کرتے ہیں۔

کل رات گئے، فکرِ سخن کے ہنگام
وجدانِ جمال کے چھلکتے ہوئے جام
وہ کشف و کرامات کا عالم کہ فراق
ہر پل پہ پڑ رہے تھے صد عکسِ دوام

یا

ہاں فکرِ سخن کے وقت کانوں میں فراق
اکثر پرِ جبرئیل کی آئی ہے صدا

جوش صاحب کی طرح فراق صاحب کا بھی مزاج ہے Reconciliation of opposite۔ یہی بات ان کے کلام کی امتیازی شان ہے جس طرح جوش صاحب کے یہاں اچانک پن کا انتہائی لطیف احساس پیدا ہوتا ہے جو قاری کی تمام تر توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ ان کے یہاں بھی انتہائی پراسرار طریقے پر ہر لمحہ اچانک پن اور نئی دریافت کا لمحہ ابھر ابھر کر آتا ہے۔ حیات و کائنات

کے بکھرے ہوئے تمام موضوعات خواہ وہ حسن و عشق ہو، نفرت و محبت ہو، ملاپ اور جدائی ہو ہر جذبہ کسی نہ کسی فضائی کیفیت میں ڈوبا اور "دھواں دھواں" کی فضا میں تہذیبی تاریخ کی روشنی میں عرش اور فرش کو سمیٹ لیتا ہے۔ انکی سب سے بڑی "سامان نگاہ آشنائی" یہ ہے کہ ہر کیفیت نیا مزاج، نیا آہنگ اور نئی معنویت کو لئے ہوئے اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کرتی اور روح عصر کو سمیٹے ہوئے دورِ جدید کو احساس و فکر کے نئے زاویے اور نئے سانچے عطا کرتی ہے۔ فراق صاحب کے ذہنی پس منظر کی تہذیب و تربیت میں قدیم ہند کی روایات کو غیر معمولی دخل ہے۔ سنسکرت کے ڈرامانویس اور شاعر بھاس نے ایک مقام پر لکھا۔

" رات کے آخری لمحے میں جلتے ہوئے دیپک
گہری نیند میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوا ہے
ہیں "

فراق صاحب کا شعر ہے

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

ایسے ہی اشعار رباعیات میں بھی جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نیچر سے متعلق خیالات میں ذہنی ہم آہنگی تمدنی پس منظر کا نتیجہ ہے۔

جوش صاحب کی رباعیات موضوع کے اعتبار سے آفاق و کائنات کی دھڑکن لئے ہیں۔ ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اور زندگی کا جو ڈرامہ مختلف عنوانات کے تحت کھیلا جا رہا ہے۔ زندگی جس طرح نت نئی صورتوں میں روپ بدل رہی ہے اور انسانیت جس طرح ہر لمحہ بہتر حیات اور نظام اقدار کی متلاشی ہے۔ زندگی کی قدریں جس قدر تیزی سے بدل رہی ہیں۔ ہر آن بدلتی ہوئی کائنات وقت کے سیلِ رواں پر جس طرح گامزن ہے۔ ان تمام

لمحات کو جوش صاحب نے رباعی کی محدود فضا میں لامحدود موضوعات کو انتہائی موثر اور خوبصورت انداز میں یوں سمیٹا ہے کہ ان کے لہجے کے تلاطم، ٹھہراؤ، نرمی، تلخی، اور زندگی کے تان پورے کے ہر تار سے ایسا راگ نکلتا نظر آتا ہے۔ اور آواز میں ایسی آفاقیت جاگ اٹھتی ہے جسے ورجل نے The sense of tears in things human نام دیا ہے۔ انہوں نے داخلی احساسات کو خارج کے سانچے میں تپایا ہے اور عصر حاضر سے ایسے ربط دیا ہے اور اپنے مخصوص لہجے میں دورِ جدید کے تمام سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی تغیرات اور بدلتی ہوئی اقدار کو اپنے گہرے شعور و ادراک کے رشتوں میں یوں پرو دیا ہے کہ وہ آواز اور وہ لہجہ ہر انسان کے دل کی دھڑکن اور زمانے کے چال سوز اور فکر انگیز کیفیات کا اٹوٹ انگ بن جاتا ہے۔ "خلوص غم"، "نالہ تشنگی"، "طلوع صبح"، "کرب سوال"، "وقت" اور ایسے ہی موضوعات کے بن جانے کتنے تناور درخت انکی رباعیات میں سموئے ہوئے ہیں۔

ہم پر چلتا نہیں غم دھر کا داؤں
شعلوں پر بھی تو ڈگمگاتے نہیں پاؤں
جو مہر قیامت سے بھی لڑ سکتی ہے
سر پر ہے وہ گھنگھور خیالات کی چھاؤں

یا

اک آگ سی رگ رگ میں بھڑک جاتی ہے
تا کاسۂ سر دل کی دھڑک جاتی ہے
ہنگام سوال، انا پہ لگتی ہے وہ ضرب
کٹتی ہے نظر آنکھ درک جاتی ہے

یا

کب سر پہ کسی نبی کا احسان لیا
رازِ کونین خود بخود جان لیا
انسان کا عرفان ہوا جب حاصل
اللہ کو ایک آن میں پہچان لیا

یا

جب نوعِ بشر ہے میرا ایماں
ہر چہرۂ زشت و خوب میرا قرآں
اللہ کو آغوش میں پایا میں نے
جیسے ہی مری گود میں آیا انساں

یا

رخسار پہ ہے بھوک کی زردی چھائی
آنکھوں میں تری ہے اور تری پرکائی
اے کاسہ بدست و ننگ بردوش گدا
کیا تجھ سے بھی ہے رزق کا پیماں بھائی

یا

قانون سے جب خموش ہوتی ہے زباں
تو ہونکنے لگتے ہیں دلوں میں طوفاں
جب پشتِ گدا کرب سے جھک جاتی ہے
سلطان کے تاج پر کڑکتی ہے کماں

کل رات گئے یہ کیا ہوا اے ہمراز
دنیا سنسان تھی بجز اعجاز
پلٹے جو ہوا نے جنتری کے اوراق
تو وقت کے گھن کی گونج اٹھی آواز

ہنستے ہیں جو لوسیدہ سیہ خانوں پر
گرتی ہے سدا برق ان ایوانوں پر
جو لو لنے دیتے نہیں پامالوں کو
گھن لو لنے لگتا ہے ان انسانوں پر

خونِ لطافت سے خدا را ہشیار
الوانِ حریرو پرنیاں خونخوار
ہر برگ کے دامن میں نہاں ہے نشتر
ہر پھول کی خوشبو میں چھپی ہے تلوار

کشتی کبھی طوفان کو ٹکراتی ہے
تتلی کبھی پتھروں کو برماتی ہے
شعلوں میں کبھی برف الٹتی ہے نقاب
شبنم سے کبھی آنچ نکل آتی ہے

محفوظ ہوں میں، دل اس سے کھل جاتا ہے
حرارت کا پھٹا لبادہ سل جاتا ہے
بالبتہ بہادروں کو کرتا ہے ذلیل
بزدل کو جب اقتدار مل جاتا ہے

جوش صاحب کی رباعیاں شش جہت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے ہر مصرعے میں گہری سماجی بصیرت اور تابندہ حقیقت کی کرن موجود ہے۔ حسن و عشق کی کرن، زندگی کی

حسین نعمتوں، لطیف یادوں، پرکیف لذتوں اور دل آویزیوں کی کرن جس کی خاطر وہ ظلمت سے ٹکراتے، انسان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگاتے اور اس کے عزم وارادے اور شعور کو آواز دیتے ہیں۔ نظم ہو یا غزل، مرثیہ ہو یا رباعی وہ ان کے مرتب ذہن، فنی بالیدگی اور پختگی، فکر کی غماز ہیں جو کبھی direct اور کبھی oblique انداز میں فنی پیکر میں روپ دھارتی ہیں۔ لیکن عقلیت پسندی اور سماجی بصیرت ان کی فکر میں روشن کی طرح کھنچی ہوئی ہے۔ اس طرح کہ "وہ حدیث دلبری"، کو حدیث کائنات بنا دیتے ہیں۔ انھیں حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک بھی ہے اور فنی جدوجہد کو اس نے جوڑ کر دیکھنے کی صلاحیت بھی۔ ان کی رباعیات میں رجائیت ہے اس میں یقین واعتماد کا پہلو بھی موجود ہے۔ یقین جو انسان کی سب سے بڑی دولت ہے اور جو شعور کی پختگی، اسباب وعلل کے رشتوں کو سمجھنے اور فنی نزاکتوں کی صحیح پرکھ سے حاصل ہوتی ہے۔

دائیں جانب مایۂ ناز ادیب و نقاد سید محمد مہدی (درمیان) حضرت جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر عالیہ امام

زبان

زبان سمندر ہے ۔ ماضی میں بہتی حال کو سینچتی اور مستقبل کو شادابی بخشتی ہے ۔
یہ روئے زمین پر ہر موڑ اور ہر گام اور ارتقا کی ہر منزل پر انسانوں کی ساتھی رہی ہے ۔ اس کا دائرہ عمل ہر شعبۂ حیات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ۔ اس کا تعلق آدمی کے عمل پیداوار سے ہے ۔
" جارج تھامسن کے بموجب اجتماعی محنت کے درمیان جب اعضا نے حرکت کی تو اس نے رقص کا روپ ڈھالا اور دوسرے جب تھکن یا خوشی کا اظہار ، یا ہا واہ سے کیا تو گویائی نے جنم لیا ۔
زبان تغیر و تبدل کی ہر منزل پر سماج کے افراد کے درمیان خیالات کے اظہار کا ذریعہ رہتی ہے ۔

اس طرح زبان سماج کے تمام ادوار حیات کی ترجمان بنی ہے خواہ وہ زمانہ تیر اور بلم کا ہو یا آگ کے استعمال کا ۔ چاک پر مٹی کے برتن بنانے کا ہو یا آتش و باراں کا ۔ اس نے ہر دور میں اپنی ایک ہیئت اختیار کی ہے ۔ مختلف عنوانات کے تحت نشو و نما پائی ہے اور ہر لفظ کو مانجھ کر اپنے دامن میں جگہ دی ہے ۔

تاریخ کے ہر دور اور ہر عہد میں سماج کا ایک بنیادی یعنی معاشی اور دوسرا بالائی یعنی قانون ، سیاست ، ادب و کلچر کا ڈھانچہ ہوتا ہے ۔ یعنی ہر سماج کے معاشی طرز حیات کے مطابق اس کے اپنے مخصوص نظریئے اور ان نظریوں کے مطابق اس کا قانونی اور سیاسی نظام فکر ہوتا ہے ۔ سماج میں پیداواری رشتوں میں تبدیلی آنے سے بالائی ڈھانچہ بھی تبدیل ہوتا ہے ۔ نئے تصورات ، نئے نظریے جنم لیتے ہیں ۔ سماجی نظریوں میں انقلاب پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن زبان سماجی شکست و ریخت کے عمل سے یکسر نہیں بدلتی ۔ کیونکہ زبان صدہا سال کی انسانی جد و جہد کے درمیان پیدا ہوئی ہے ۔ وہ کسی ایک گروہ یا طبقے کی میراث نہیں بلکہ تمام طبقات کی امنگوں ، آرزوؤں اور اجتماعی عمل کی پیداوار ہے ۔ اس کا کام کسی ایک طبقے کے مفاد میں کام کرنا اور دوسرے کو محروم رکھنا نہیں ہوتا ۔ وہ تو پورے سماج کو بلا تفریق سیراب کرتی ہے ۔

طبقاتی سماج میں بالائی طبقے اپنے مفادات کے پیش نظر زبان کو استعمال

کرتے ہیں ۔ "بالائی" طبقے اپنے مفادات کے پیش نظر زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ "بالائی" اور "عوامی زبان"، کی حد بندیاں کرتے اور حصار کھینچتے ہیں۔ خاص الفاظ خاص اصطلاحیں اور ترکیبیں ٹھونستے ہیں۔ اور اس طرح زبان کی گہرائی وگیرائی کو اپنے طبقے کا پابند بنانے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں۔ 'مزدوروں، اور 'کسانوں، کی زبان بالائی طبقے کی زبان کا فرق پیدا کرنے کی کوشش میں وہ بھول جاتے ہیں کہ جسے وہ زبان سمجھ رہے ہیں وہ "عوامی بولیاں، ہیں جو زبان سے بالکل مختلف ہیں۔ کیونکہ وہ اپنا مخصوص نظامِ صرف ونحو نہیں رکھتیں۔

زبان خواہ وہ اردو ہو یا فارسی، عربی ہو یا ترکی اس کا بنیادی اثاثہ ذخیرہ الفاظ اور صرف ونحو کے قواعد ہوتے ہیں۔ معاشی رشتوں میں تبدیلی اور نئے طبقات کے وجود میں آنے اور نئے آلات پیداوار بننے سے زبان کے صرف ونحو کے نظام میں تبدیلی نہیں آتی ہاں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ پرانے اور فرسودہ الفاظ متروک ہوجاتے ہیں۔ نئے الفاظ، نئی تراکیب، اور نئے آلات سے متعلق الفاظ کا ذخیرہ اکٹھا ہوجاتا ہے۔ جو زبان کے دامن کو وسیع اور اس کے پاٹ کو چوڑا کر دیتا ہے۔

ہندوستان میں تہذیبی ارتقا کی داستان بیان کرتے ہوئے اردو زبان اور اس کے تغیر وتبدل کی کہانی کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ زبان خواہ کوئی بھی ہو اس کا ارتقا تدریج دار ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زبان قانونِ نمو کے تابع ہے۔ زبان کا اپنے عہد کے رجحانات اور اس زمانے کی ضروریات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔

اردو جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ہند آریائی زبان ہے۔ صرف اردو ہی نہیں بلکہ آسام سے نیپال اور سنٹرل انڈیا تک جتنی زبانیں بولی جاتی تھیں وہ سب آریائی زبانیں تھیں۔ فارسی بھی آریائی زبان ہے ۔ ۱۰۰۰ء میں مسلمان اپنی فارسی زبان کے ساتھ جب ہندوستان میں آئے اور پنجاب ان کے زیرِ نگیں ہوا تو اس کا لازمی اثر وہاں کی زبان پر پڑا۔ یہ وہ وقت تھا جب سورینی پراکرت کی اعلیٰ شکل اپھرنش وہاں بولی جاتی تھی۔ پراکرتوں میں نئے سماجی حالات نے نئے

پہلو پیدا کئے جن میں سے ایک بہت نمایاں تھا وہ یہ کہ یہاں کی زبانوں میں فارسی اور عربی کے الفاظ شامل ہونا شروع ہوئے اس طرح فارسی زبان داں بھی یہاں کی بولیوں سے متاثر ہوئے نسلاً بعد نسلاً زبان سینوں میں جگہ بناتی گئی ۔ ۱۲۰۰ء کے نزدیک مسلمانوں کا مرکز دہلی قرار پایا۔ چنانچہ نتیجے کے طور پر وہاں کی زبان میں فارسی اور عربی کے الفاظ نمایاں جگہ بنانے لگے۔ ہندوستانی آوازوں میں بہت سی نئی آوازیں شامل ہو گئیں ۔ وقت گذرنے کے ساتھ دہلی کے قرب وجوار میں باہر سے آنے والوں اور یہاں کے باشندوں کے درمیان اختلاط سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جسے اردو (ہندوستانی) کہا جاتا ہے۔ جو تمام قیود و پابندیوں کو ٹھکراتی ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچ گئی۔ اور حسن کا خراج ہر محلہ کوچے اور قریہ سے وصول کرنے لگی ۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان کسی مطلق العنان حکمراں کے 'کن' و 'فیکون' کا نتیجہ نہیں ہے ۔ وہ عوام کی سماجی ضرورتوں کا سہارا لے کر پیدا ہوئی ۔ اس نے زمین سے شادابی اور تری لی ۔ سنگلاخ چٹانوں کو توڑ کر اپنے لئے جگہ بنائی ۔ اور ہندوستان کی مختلف بولیوں سے میل جول بڑھا کر اپنا مخصوص نظام صرف و نحو جنم دیا ۔ سیاسی ، سماجی اور تہذیبی اختلاط کو بڑھاوا دیا ۔ قومی جذبات کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ اتحاد ملی کی علمبردار بنی ۔ جنگ آزادی کی مشعل بردار رہی اور آہنی قوتِ استدلال سے اس جنگ کو سر کیا ۔ سماج کے "اعلیٰ" اور "ادنیٰ" طبقوں کا ساتھ دیا ۔ اس کی روایت اتحاد ، پریم ، محبت اور ترقی رہی ۔

اردو زبان کی وسیع و بسیط دنیا میں جوش صاحب نا معلوم الفاظ کے عامل ، غیر معروف کے عارف اور نا منظور کے ناظر ہیں ۔ جنہوں نے اپنی آہنی عقل ، فولادی جگر ، اور دانائی و احتیاط کے ساتھ اردو زبان کی سونے کی کان میں جا کر مٹی سے سونا جدا کر کے اسے ایسا "زرِ خالص" دیا جس کی رتی رتی جگر جگر کرتی ۔ چمکتے رنگوں کو اچھالتی ، گاگروں کو چھلکاتی ، بانکی صبح طلوع کرتی ۔ زندگی کے رخسار پر چاندنی چھڑکاتی ہے ۔ جس سے زبان کی ویراں گلیاں آباد ہوتی ہیں ۔ اس کا گوشہ گوشہ گل رنگ ہو جاتا ہے ۔ جس کی روشنی کے سامنے قندیلِ حرم گل ہو جاتی ہے ۔ کلیسا کے

چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ چھلکتے ہوئے مینانوں کی سانس رک جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی شے کی بقا ترقی کے اصول اور قواعد کا علم حاصل کیے بغیر اس چیز کا تحفظ ہر آن اور ہر لحہ متغیر دور میں کرنا ممکن نہیں۔ جوشؔ صاحب زباں داں بھی ہیں اور علم اللسان کے آشنا بھی۔ زبان کی پیدائش اور ارتقا کے اصولوں پر انکی گہری نگاہ ہے کیونکہ جس وقت تک کوئی شخص زبان کی سماجی حیثیت سے آگاہ نہ ہو اس وقت تک اس میں تنظیم ترتیب وتشکیل اور تبدیلی کی راہ میں آگے قدم بڑھانا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں۔

زبان کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"زبان ہرا بھرا درخت ہے۔ جس کی شاخ سے متروک الفاظ خشک پتیوں کی طرح گر جاتے ہیں ... نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ پرانی پتیاں ایندھن بن جاتی ہیں ... وہ زمین سے پانی کھینچ کر ابلاغ کے نئے پھول کھلاتا ہے ...... اکھوے پھوٹتے ہیں۔ شاخیں نکلتی ہیں۔ روزمرہ کے سانچے بنتے ہیں ...... نئے محاورات ڈھلتے ہیں .... پرانی زبان سوکھے درخت کی طرح زمین پر ڈھیر ہو جاتی ہے۔ بھاڑے میں ایندھن کی طرح جھونک دی جاتی ہے۔"

زبان میں الفاظ کی قیمت کیا ہے۔ اس کے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"جب تنگ ظرف اور سنگ دل زبان دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے شہر میں بسنے نہیں دیتی ..... اس قدر وسعت بیزار ہو جاتی ہے کہ جب کوئی مسافر اس کا دروازہ کھٹکاتا ہے تو اس کو پناہ دینے کے عوض اس کو قتل کر دیتی ہے ... غیر مہماں نواز ڈائنوں کی طرح سنگدل، ملاؤں کی طرح تنگ ظرف، سود خواروں کی طرح مہمان بیزار ..... پھر ایسی زبان کو زمین بھی جگہ نہیں دیتی ...."

دوسرے مقام پر الفاظ کی قدر وقیمت اس طرح واضح کرتے ہیں۔

"الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو۔ وہ نہ تو بے جان لکیریں ہیں نہ ہوا کی گرہیں .... الفاظ تو ذی حیات ہیں۔ انسانوں کی روح ذی حیات۔

ان میں بھی مختلف نسلیں خاندان اور شجرے ہوتے ہیں اور ہر خاندان اپنے ہی کف اور عزیزوں میں شادی کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں بھی بعض تو ہم انسانوں کی طرح نیک نام اور بعض بدنام ۔

" تمام الفاظ میں ایک عجیب مشترک عمومی خصوصیت ہے کہ وہ بے ہمہ و باہمہ رہنا ہی پسند کرتے ہیں ۔ ملتے تو سب سے ہیں لیکن اپنے کو لئے دیئے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلد بے تکلف ہو جانے کو برا سمجھتے ہیں اور دیر آشنائی پر کاربند رہتے ہیں ۔ جب تک کوئی اللہ کا بندہ ان سے ملے جلے نہ ان کی گلیوں کی خاک نہ چھان ڈالے ان کی غمی و شادی میں شریک نہ ہو ۔ ۔ ۔ انکی نبضوں کی رفتار ، انکی ذاتی و خاندانی صفات کو نہ پرکھ لے اس وقت تک یہ مغرور یا شرمیلے الفاظ اس سے بے تکلف نہیں ہوتے اور اسے اپنے مزاج کی افتاد اور اپنے اسرار سے آگاہ کرنا پسند نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ البتہ شاعروں سے ان کا برتاؤ قرابت داروں کا سا ہے ۔ ۔ ۔ اس لئے انہیں اختیار دے دیا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس بدل دیں ۔ انکی لے اور رنگ بدل دیں ۔ ان کے خد و خال میں کمی و بیشی کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاعر کے سامنے آتے ہی ذات پات کی آویزش باقی نہیں رہتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب ایک ہی تھالی میں کھاتے ایک ہی کوزے میں پیتے ایک ہی حلقے میں بیٹھ جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاعر کا مکان الفاظ کی عبادت گاہ ہے ۔ جہاں ادنیٰ اعلیٰ شاہ گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور صفوں میں ایسی شائستگی ہوتی ہے جیسے راگنی کے لولوں میں ہم آہنگی "

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں ۔

" الفاظ کو ہوائی امواج اور کاغذی نقوش نہ سمجھو ۔ یہ امواج و نقوش نہیں ذی حیات افراد ہیں ۔ ان میں بھی ہماری طرح ادنیٰ و اعلیٰ خاندان پست و بلند کا طبقاتی وجود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں بھی سنجیدہ ٹھٹ ، سفلہ و موتی افراد پائے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ انکی عورتوں میں بعض بے نقاب ہو کر گلی گلی تھرکتی ۔ بعض سختی کے ساتھ پردے اور

حجروں میں دبکی رہتی ہیں بعض ناچتی اور بعض دانش گاہ کے اساتذہ کے زبردست لبتہ کھڑی ہوتیں . . . . ایک خصوصیت بلا استثنیٰ یہ ہے کہ جہاں تک اجنبیوں کا تعلق ہے بلا کے شرمیلے، قیامت کے دیر آشنا . . . انتہائی درجے کے خود پوش۔ انکی شریعت میں جلد گھل مل جانا حرام ہے۔ نو واردوں کو اپنی ہر گام پر مڑتی ہوئی گلیوں اور اپنی تھکا دینے والی بھول بھلیوں کی سیر کبھی نہیں کراتے۔ اپنے مہمان بادشاہوں کا استقبال کبھی کھل کر نہیں کریں گے . . . کہ اپنے روزمرہ محاورت اپنے ضرب الامثال کی پیچ پیچ شہر کی کنجیاں پیش کر دیں۔ اس لئے یہ بات ان کے ایمان میں داخل ہے۔"

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ " میرا مشورہ یہ ہے،

" جو عرفان الفاظ کے تمنائی ہیں ان کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ الفاظ کی دنیا میں اس قدر ربط وضبط بڑھایئے۔ ان کے گھروں میں اتنی مدت دراز تک آیئے جایئے کہ کالے بال سفید ہو جائیں۔ آپ کا شمار افراد خاندان میں ہونے لگے اور آپ سے اس قدر مانوس ہو جائیں کہ بند قبا کھول کر بیٹھ جائیں۔ ان کے مردانے خزانوں کی کنجیاں آپ کے سامنے ڈال دیں اور انکی لاج بھری کنواریاں تک آپ سے پردہ اٹھائیں۔"

" الفاظ سواریاں ہیں خیالات کی "، جوش صاحب کے اس بیان سے انکار ممکن نہیں۔ خیال اگر منزل ہے تو الفاظ راستہ ہیں لیکن اگر مسافر کو منزل کا علم ہو لیکن وہ اونچی نیچی پگڈنڈیوں، پھسلتی ڈھلوان اور شاہراہ کے اتار چڑھاؤ سے واقف نہ ہو تو منزل تک پہنچنا آسان نہیں یعنی خیال خواہ کتنا ہی دقیع وجاندار کیوں نہ ہو لیکن اگر لفظ ومعنی سے ناآشنا احباب قرطاس کے میدان میں قلم سے کبڈی کھیلیں ۔ تو وہ کندن بیان بیان نہیں کر سکتے۔ الفاظ میں گونگوں کے لئے کوئی جان نہیں۔ اندھے کو عینک دنیا دونوں کو شرمسار کرنا ہے۔

نظیر اکبر آبادی، میر انیس، اور حضرت جوش ملیح آبادی اردو زبان کے موتیوں کے پہاڑ ہیں جس سے موتی اور سونے کا آبشار زمین پر برس رہا ہے۔ جوش صاحب کا ہر لفظ سرفراز

درخت ہے جسے جنبش نہیں دیجا سکتی ۔ وہ موم کی طرح پگھلتا اور جلتا ہے ۔ کہیں وہ چاندنی کی نرم آنچ میں تپتا ہے ۔ کہیں صدائے تیشہ ہے ۔ کہیں تاروں کا بن اور کہیں جگمگاتا بدن ہے ۔ کہیں وہ دل کے انگاروں کو دہکا دیتا ہے کہیں بانسری کی تان بن کر دل کو موہ لیتا ہے ۔ کہیں زخموں کے چراغ جلاتا ہے تو کہیں شبنم کا ڈھلکا ہوا آنچل بن جاتا ہے کہیں نورِ سرطور ہے کہیں بولتی جاگتی آنکھوں کا رس ہے کہیں خیال کی خوشبو کہیں مست آنکھوں کی جھیل ۔ کہیں حلقہ ءِ غم میں یکسر تنہا کہیں پگھلے ہوئے سیسے کا سمندر کہیں آنسوؤں کے کنول کھلاتا کہیں اجتہاد کے دروازے کھولتا ہے ۔ غرضیکہ انکی زبان دانی اور الفاظ شناسی کے ایسے کرروں شیوے ہیں جن کا کوئی نام نہیں ۔ جوش صاحب کی زبان ، الفاظ کا جڑاؤ لینی جھلکے نہیں وہ نظیر اکبر آبادی ، سودا ، غالب ، میر انیس اور اقبال کی حسین شعری روایات اور ہندوستان کی تہذیبی لو کو ایک سینے سے دوسرے سینے میں جگانے اور چراغاں کرنے کا نام ہے ۔ انکی زبان کہیں ہندوستان کے مرغزار زندگی کی چہک ہے تو کہیں جلتی سوئی چتا ہے ۔ کہیں دیوالی کے دیپ جلاتی ہے ۔ رنگ کھیلتی ہے رخسارِ زبان پر چاندنی چھٹکاتی ہے ۔ لفظوں اور تراکیب سے کہیں صبح نو کا آنچل بناتی ہے کہیں انکی حلاوت سے افق ذہن پر دھنک نکالتی ہے ۔ رزم میں کہیں آنسوؤں کا دائرہ بنتا ہے بزم میں کہیں فصلِ گل کا پیام دیتا ہے ۔ ایسا پیام جو شاخ گل سے گل تر تک پہنچتا ہے ۔

میر انیس نے " اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں " کہہ کر محض لفاظی نہیں کی تھی بلکہ " ہر جہتی دیدہ دری " کی جانب اشارہ کیا تھا ۔ جوش صاحب کی " دیدہ دری " اور الفاظ کا سونا ۔ تراکیب کی ندرت ، تشبیہات و استعارات کا سیل رواں ہے جن میں انسانی زندگی موتی کی لڑی کی طرح پروئی ہوئی ہے ۔ انکی تراکیب ، تشبیہیں ، استعارے ، اصطلاحیں نہ وحی کی صورت میں آسمان سے نازل ہوتی ہیں نہ ہی ان کا ذہن تفریحاً اس کی تخلیق کرتا ہے ۔ کیونکہ داخلی اور خارجی حالات کے نتیجے میں جس وقت کسی فرد کا ذہن کوئی نیا تصور ، نیا خیال نیا مشاہدہ نہ کرے تو ذہن اس کے اظہار کی ضرورت محسوس ہی کیوں کریگا اور اگر اظہار کی ضرورت اور

افادیت ہی مقصود نہیں تو زبان سے کیا فائدہ ؟ زبان کو نت نئے الفاظ نت نئے خیالات کی ضرورت اسی لئے ہے تاکہ اس کے خون کی گردش جاری رہے۔ کیونکہ اگر زبان میں لہو نہیں تو تہذیب و ادب بلکہ پورے سماج کے دل کی دھڑکن بند ہونے کا قوی امکان ہے۔ زبان کا دھارا تیز سے تیز تر ہوتا ہی اس وقت ہے جب اس میں نیا خون آتا ہے وہ مقید اور محبوس نہ ہو۔ ورنہ عبرانی اور سنسکرت ادب کی مثال بن جاتا ہے۔ جوش صاحب نے زبان کو مختلف پیرایوں سے نیا خون دیا ہے۔ جو انکی عقلیت پسندی اور انقلابی نقطہ نظر پر دلالت ہے۔ تاکہ وہ کسی ایک طبقے کی ملکیت نہ بن جائے کیونکہ اس طرح اس کا دامن سکڑ جاتا ہے۔ جمود ہوتا ہے۔ اور جمود میں تعفن کا ہونا لازمی ہے۔ انہوں نے زبان کے دامن کو وسعت اس طرح بخشی ہے کہ پوری ہندوستانی تہذیب، عوام کے تجربات، مشاہدات، جذبات، خیالات، کی ترجمانی کی ہے۔ زبان میں انہوں نے اک جہاں نو، بیدار کیا ہے۔ کبھی نادر تشبیہات اور اچھوتے استعاروں سے

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

"یہاں انکی تشبیہات، اور استعارات میں آتش سیال کا سا ابال اور جوش پیدا ہوتا ہے ...... ان استعارات کی جدت اور ندرت متحرک اور زلزلہ خیز ہے ...... کون انکار کر سکتا ہے۔ ایسے لفظوں کی پُر شوکت روانی، ان کے وزن ان کے الفاظ کی بے محابا ترتیب، ان کے جذبات کی خودسری میں انقلاب کے آہنی قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی۔"

(ترقی پسند ادب۔ عزیز احمد)

فرنگی حکومت کے قیام نے ملک میں جس طرح جمود اور بے حسی کا دھارا توڑا۔ نئے ذہن نے جس انداز کروٹ لی، فکر میں جس عنوان بیداری آئی۔ نئے ماحول سے مطابقت

کی خاطر جس طرح سیاست، معاشرت، تہذیب نے اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھالا چمن کی آرائش کے لئے جس نوع خونِ جگر، گرمئ نفس، اسرار و رموز زندگی، تعمیر و تخریب کے تمام پہلو امیدوں اور حوصلوں کا چمن جس طور لہلہاتا نظر آیا اس کی تصویر کشی سیال روپ میں جوش صاحب نے "ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب" میں کی ہے۔ اس کی نظیر شاید و باید، جرأت فکر کا ایسا بے بہا سرمایہ۔

جوش صاحب کی زبان میں محض تشبیہوں اور استعاروں کی رنگینی، پرشکوہ الفاظ کی روانی ہی نہیں وہ علمی سنجیدگی فلسفیانہ وقار اور خیال کی ندرت کا خزینہ لئے ہوئے ہے، کیونکہ محض زورِ بیان اور طرز ادا ہی تو سب کچھ نہیں۔ سچا تجربہ صرف اسی بنیاد پر تو وجود میں نہیں آتا موضوع اور طرز ادا دونوں شعر کے دو مصرعے اور گیت کے دو بول ہیں۔ موضوع خواہ کتنا ہی دقیع کیوں نہ ہو لیکن طرز ادا نہیں تو بیکار کیونکہ سچائی، خلوص، تجربات کا حسن، مشاہدہ کی لو سہولت اظہار کے بغیر ممکن نہیں۔ سامع اور فنکار کا رشتہ تو نطق کا ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ شاعر کے دل میں کیا ہے۔ جو بات صفحۂ قرطاس پر آئے گی اسی پر "واہ" یا "آہ" کرنا ممکن ہے۔ اسی طرح موضوع اگر پہلے ہی نہیں تو طرز ادا کیا کرے گی۔

جوش صاحب کے الفاظ محض کاغذی نہیں معنویت کا جہان لئے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ موضوع اور طرز ادا دونوں پر انہیں گرفت ہے۔ انہیں اس بات کا گہرا علم ہے کہ موضوع کی رنگینی بغیر خوبیٔ اظہار کے اگر ناقص ہے تو طرز ادا کی رنگینی بغیر موضوع سے گہری واقفیت کے بے معنی ہے۔ اس میں شک نہیں اولیت موضوع کو ہے جو اپنے ساتھ اسالیب لاتی ہے۔ ایک موضوع جو تقریباً دنیا کی شاعری و ادب کا موضوع رہی ہے جس پر دنیا کے عظیم ترین فنکاروں نے قلم اٹھایا ہے۔ وہ ہے "آدم"۔ آدم جو ہر آن ہر لحظہ "جہان دگر" تعمیر کرتا ہے۔ جس کے گرد کائنات رقص کناں ہے۔ جوش صاحب کے یہاں اس انداز سے آتا ہے۔

نور گیتی، مشعلِ افلاک، شمعِ انجمن
اک مجسم کج کلاہی، اک سراپا بانکپن
شارحِ آیاتِ ملیحتی، شارحِ دینِ حیات
قاضئ شہرِ صفات و کاتبِ دیوانِ ذات
اک زمیں پرور محقق اک فلک پیما حکیم
ایک مقیاسِ تجلی اک رصد گاہِ عظیم
آسماں کا داور دارا زمیں کا کج کلاہ
بر کا آقا بحر کا مولا فضا کا بادشاہ
عالمِ اسباب کی محرابِ اعظم کا چراغ
پیکرِ ارض و سما کے کاسۂ سر کا دماغ

جوش صاحب ایک زمین سے چار چار فصلیں اگاتے ہیں۔ سماج تغیر پذیر ہے۔ اس لئے اس کا اثر زبان کو ہر قیمت پر قبول کرنا ہے۔ جوش صاحب کا ہر لفظ شعر کے پورے پیکر میں لہو کی گردش بن کر دوڑتا ہے۔ نغماتی تاثر پیدا کرنا ہے جسے صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جو جمالیاتی احساس کی اعلیٰ منزل پر فائز ہیں۔ کہ بے آواز جھنکار کو کس سطح پر کب اور کس وقت ابھاریں کہ شعر پوری فضا پر چھا جائے۔ کس حد تک مخفی حالت میں رکھیں کہ وہ نازک اور لطیف تاثر پیدا ہو اور ترغیب عمل ہو جو شاعری کا مطلوب و مقصود ہے۔ ان کا اندازِ بیان لطیف سے لطیف خیال کو جو غیر محسوس ہے محسوس بنا دیتا ہے۔ اور پورے عہد کی علامتوں کو سمیٹ لیتا ہے۔

انکی شاعری میں ایک طرف جاگیر دارانہ عہد کے خطوط کا خاموش ترنم ہے جسمیں کا لوچ ہے۔ تو دوسری جانب مشینی عہد کے حرکت کرتے ہوئے انجن، مشین کے پرزے، اور ہوائی جہاز کے فولادی جسم ہیں جو صرف خیال کی دنیا میں شمع روشن نہیں کرتے بلکہ سماج کے ہر تیور سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں یہ پہلو انکی عقلیت پسندی اور انقلابی مزاج کی عکاسی ہے۔

ان کے پاس خیال کے ساتھ ساتھ ایک ایسا تعلق ہے جو نفوس کے اسرار اور قلوب کے ضمائر کی خبر دیتا ہے۔ یہاں ہینچ کر ان کا ہر شعر سارنگی کے طربوں کی طرح ایک خاص وزن یا قوت سے مختص ہے۔ کیونکہ جس طرح ایک ہی قوت اور وزن کے تمام تار آپس میں ہمدردی رکھتے ہیں۔ اگر ایک کو ذرا جنبش ہوئی تو دوسرے خود بخود بجنے لگتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے طبلے پر ٹکوریں مچل رہی ہیں۔ گوکل بن میں رادھا ناچ رہی ہے۔ الفاظ کے صوتی آہنگ سے ایسی فضا پیدا کرنا کہ اس کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ خرابات کے برآمدے سے آڑی ترچھی بوچھار ہونے لگے۔ سونے کی پائل جھنک جھنک بجنے لگے۔ رقص و رنگ جھولنے لگیں۔ جذبات کے دھڑکنے کی لے تیز ہو جائے۔ شاخوں پر نادمیدہ غنچے چٹکنے لگیں۔ نفسِ انسانی حرکت میں آجائے۔

گل چہرہ پتیوں پہ نگینے جڑے ہوئے
گوشِ چمن میں اوس کے بندے پڑے ہوئے
غلطیدہ فصلِ گل کی گھٹا چشمِ ناز میں
رودادِ شب تموجِ زلفِ دراز میں
کہرے کی وادیوں سے جھلکتی ہوئی فضا
جبلور سے کہ بھاپ کی چادر میں آئینہ
گویا نقابِ جلوۂ جاناں لئے ہوئے
یا شمع ہے کوئی تہہِ داماں لئے ہوئے

ترنم موسیقی نہیں ہے۔ بلکہ شعر کی ایک تہہ در تہہ چھپی ہوئی داخلی کیفیت ہے۔ جو خاموش سروں میں ذات پر چھا جاتا ہے۔ اور وجد کی کیفیت میں پڑھنے والے کو لے آتا ہے۔ شعر میں ترنم، نغمگی اور غنائی کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے شاعر کو سنگلاخ زمین سے گذرنا پڑتا ہے۔ بحر اور دیگر ارکان کی مخصوص تنظیم و ترتیب پر نگاہ رکھنی ہوتی ہے۔ ارکان کی اس تنظیم میں جمالیاتی حس کے مطابق تحریف کرنے کا مادہ، قافیہ پر قدرت، ردیف کے صوتی اثرات پر نگاہ

شعر میں الفاظ کی تراکیب کی آمیزش سے آگہی، ترکیبوں کی بناوٹ، ہر لول کے کٹاؤ کے رمز سے واقفیت ضروری ہے۔ موسیقی میں خیال کی ندرت اور اچھوتے پن کو سمجھنے کے لئے ساتوں سُروں کو سمجھنا ضروری ہے۔ یعنی سرگیان کے بغیر موسیقی جاننے کی بات ممکن نہیں۔ اگر کسی راگ میں وادی سر کی جگہ سم سر کو رکھ دیں، انو وادی کو وادی اور سمو وادی کا مطیع بنانے کے بجائے من مانے انداز میں استعمال کریں تو راگ کا روپ بھرا ہو جائے گا۔ یا پت تال میں چھ ماترے اور دو ضربیں دینے کے بجائے کچھ اور کر دیں۔ کہروا میں ۸ ماترے کی جگہ ۱۰ ماترے بجا دیں تو ہم اور آپ تو کچھ نہیں کر سکیں گے لیکن بڑے غلام علی خان صاحب، استاد ولایت علی خاں صاحب اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ جس طرح خیال کی ادائیگی کے لیے تال ادھیائے اور سرادھیائے دونوں لازم ہیں۔ اسی طرح جوش صاحب کے نطق ہزار شیوہ کی روح تک پہنچنے کے لئے زبان اور خیال کی باریکیوں کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

انگریز مصنف "جارج طامسن" نے پرانے یونانی سماج کا مطالعہ بہت گہرائی سے کرتے ہوئے اس پہلو پر کہ شعر، رقص اور موسیقی کا باہمی تعلق کیا ہے اور اس کی بنیاد کیا ہے اس پر بہت فکر انگیز بحث کی ہے۔ اس کا خیال ہے جمالیات وجدان کی پیداوار نہیں۔ جمالیات کا تاریخی ارتقا ہوا ہے۔ کسی بھی شخص کا جمالیاتی ذوق بنا بنایا پیدائشی نہیں ہوتا وہ تغیر پذیر سماج کی بنیادوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس کی بنیاد مادیت پر ہے۔ دل کو وجدان اور دماغ کو عقل سے تعبیر کرنا محض شاعری ہے۔ ہر جذبہ پختہ یا ناپختہ عقل کے زیر اثر ہے۔ شاعری اس کے نزدیک انسان کا پہلا جمالیاتی عمل ہے۔ رقص و موسیقی و شاعری اس کے مطابق اجتماعی محنت کے درمیان عمل میں آئے۔ چکی چلانے کے عمل سے گیت نے جنم لیا اور ترنم نے بھی اعضاء کی حرکت سے رقص کی شکل نکالی۔ رقص جوش صاحب کے نقطۂ نگاہ سے "اعضا کی شاعری ہے" جوش صاحب الفاظ کے کٹاؤ اور خوبصورت تراکیب سے نہ صرف خیالات کی مجسمہ سازی کرتے ہیں بلکہ آواز کو تصویر بنا کر دکھانا الفاظ کو

ٹکڑے ٹکڑے کر کے موسیقی پیدا کرنا ان پر ختم ہے۔

انگڑائیاں جو آئیں تو آنکھیں جھپک گئیں
رگ رگ میں ولولوں کی کمانیں کڑک گئیں
رخسارِ پر شباب کی کلیاں چٹک گئیں
جو چوڑیاں خموش پڑی تھیں کھنک گئیں
موباف میں اسیر شبِ تار ہو گئی
جوڑا بندھا تو صبح نمودار ہو گئی

" الفاظ خیالات کی کیونکر سواریاں ہیں " مترنم انداز میں یوں نظر آتے ہیں۔

جب اشاروں کو صدا بن کر نکھرنا آگیا
اور صدا کو لفظ میں ڈھل کر ابھرنا آگیا
لفظ کو پھر حرف بن کر گل کترنا آگیا
خاک صامت کو بالاخر بات کرنا آگیا

لب ہلے تو کشتیاں چلنے لگیں اعجاز کی
فکرِ انسانی کو سواری مل گئی آواز کی

زبان رجحانات وقت سے متاثر ہوتی ہے۔ انسانی ضروریات کے مطابق وہ اپنا مزاج ڈھالتی ہے۔ صوتیات اور لسانیات سے واقفیت کی بنیاد ہی پر اس کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ روایات کے تسلسل سے زبان کا مزاج بنتا ہے اور یہی مزاج شاعری میں داخل ہو کر ایک مخصوص زبان بولنے والوں کے لئے عظیم سرمایہ عطا کرتا ہے۔ جوش صاحب کی زبان، ان کے خیالات اور طرز ادا کو سمجھنے کے لئے ایک طرف قاآنی، حافظ، خیام اور فردوسی کے مزاج کو سمجھنا ضروری ہے۔ دوسری جانب برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی کروٹوں

تغیر کے سماجی و عمرانی اسباب، صوتیات کے مختلف پہلوؤں پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے زبان کا وجود سماجی ضرورتوں کا رہین منت ہے۔ سماج کی ضرورتیں زبان کی سنگلاخ زمین میں اپنا راستہ بنا لیتی ہیں۔ تاریخی، تہذیبی روایات کا تسلسل، ارتقا و تغیرات کے اسباب و علل کو سمجھے بغیر کسی بھی زبان کی خوبصورتی اور اس کی معنویت کی تہوں کو پانا ممکن نہیں ہے۔ اردو زبان پر پاکستان کی علاقائی بولیوں کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ جو شخص مختلف بولیوں اور زبانوں کے الفاظ لینے سے انکار کرے گا وہ زبان و ادب کے ساتھ زیادتی کرنے کا مرتکب ہوگا۔ جوش صاحب کی زبان کا پاٹ بہت چوڑا ہے۔ وہ گدلا پانی نہیں جس کی تہوں میں مٹی ہی مٹی ہو بلکہ اس کا سینہ حاتم طائی کی طرح چوڑا اور سمندر کی طرح بے کراں ہے جو کنکر پتھر کو سمیٹتی اور موتیوں کو رولتی ہے۔ اعلیٰ شاعری کے لئے زبان کے پاٹ کا چوڑا ہونا لازمی ہے۔ ان کی زبان و بیان صرف تشبیہ، استعارے، تراکیب، محاورے، اور قافیہ بندی تک محدود نہیں وہ علم کا بار اپنے مضبوط کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں بیرونی اور مقامی الفاظ و اصطلاحات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ وہ نئے الفاظ اور نئے انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہیں ہچکچاتے نہیں۔ کاروبار حیات کے تمام شعبے، صحافت اقتصادیات کے نئے گوشے تجارت و سیاحت کے نئے کرشمے، سائنس و ٹیکنالوجی کے تمام پہلو زندگی کا ہر انداز ان کا قلم سمیٹے ہوئے ہے۔ " موجد و مفکر "، " حرف آخر "، جیسی نظمیں اس کا بین ثبوت ہیں۔

یہ کرہ یہ آب و گل کی کارگاہ بہت ولود
قبل از پیدائش تاریخ ہے جس کا وجود
رقص میں کب سے ہے یہ رقاصۂ جادو ادا
ذہن میں آتا نہیں اندازہ ماہ و سال کا
عمر کیا ہے اس تماشا گاہ ابرو باد کی
غور کرتے وقت رک جاتی ہے سانس اعداد کی

یہ مہ و خورشید یہ سیارگانِ ہفتمیں
اور انہیں کے ساتھ یہ گرونده و غلطاں زمیں
ایک ہی حلقے میں رقصاں تھے یہ سب آتش جمال
جن کے گرد اگرد تھا لرزنده اک شعلوں کا جال

اس نظم میں اردو زبان کی علمی سطح کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ اردو زبان کو جوش صاحب نے جس طرح خونِ جگر سے سینچا۔ اس کے ایک ایک لفظ کو ہیرے کی تراش خراش بخشی اور اسے جس طرح ادب میں نگینوں کی طرح جڑا اور اس مقام پہ پہنچایا کہ ان کا ہر لفظ سند بن جائے اور زمانے کی بڑی سے بڑی زبان سے آنکھ چار کر کے بات کر سکے ان کا اتنا بڑا اور عظیم المرتبت کارنامہ ہے جس پر جب تک ایوان اردو ادب زندہ ہے اونچائی، مضبوطی، پاکیزگی اور بزرگی سے اس کا سر اونچا رہے گا۔

ان کا کہنا تھا جس نے بھی اردو کی چھاتی سے دودھ پیا ہے اور وہ جوان ہوا ہے اس پر قرض اتارنا فرض ہے۔ ہندوستان میں جوش صاحب بے تاج کے بادشاہ تھے۔ انکی ایک ایک ادا پر سو جان سے پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کے وزیراعظم نثار تھے وہ کروڑوں انسانوں کے محبوب تھے۔ ان کے چہرے کا دیدار دہاں کے لوگوں کے لیے عبادت تھا۔ ان کے کوچے میں قدم رکھنا ان کے لیے کعبہ کا طواف تھا انکی یاد میں سوچنا شب قدر کی بیداری تھا۔ ذرہ ذرہ ان کی عزت کرتا تھا وہ بھی ہندوستان کے ذرے ذرے کی عزت کرتے تھے۔ لیکن جس وقت ہندوستان میں حکومت زبان کے مسئلہ کو حل نہیں کر سکی اور اردو اور ہندی کا قضیہ طول پکڑ گیا۔ سنسکرت آمیز ہندی عوام پر تھوپی جانے لگی۔ اردو جس نے آزادی کا چراغ ہی نہیں جلایا تھا بلکہ آزادی کی جنگ میں قائد کا کردار بھی ادا کیا تھا جب ہندوستان آزاد ہوا اور اسے "جلاوطنی" دے دی گئی۔ اس کے جڑوں سے اکھاڑ کر صرف نمائشی طور پر پرچم بنا دیا گیا۔ اس وقت جوش صاحب کے جمے ہوئے قدم اکھڑ گئے۔ دماغ پر چوٹ پڑی اس کے شعلے قلم سے یوں ٹپکنے لگے۔

"گدی سے کھینچ لی جو زباں تھی عوام کی"

اور جوش صاحب نے اپنی سونے چاندی اور موتیوں کا بھرا تھال یوں الٹ دیا جیسے باسی دیگ الٹ دی جاتی ہے۔ اپنی شخصیت کا تناور درخت اکھاڑ کر پاکستان اس یقین کے ساتھ چلے آئے کہ یہاں اردو کی خدمت کریں گے اسے پھلتا پھولتا دیکھیں گے ہر پتے اور بوٹے پر اردو کی چھاپ لگتی دیکھیں گے۔ اردو کے "صوت ہزار کا موسم" دیکھنے کی تمنا لئے جوش صاحب ہندوستان سے رخصت ہوئے۔

اردو زبان کے سلسلے میں جوش صاحب متعصب نہیں تھے۔ وہ ہندی کے رسیا تھے۔ لیکن وہ ہندی جو تلسی داس، کبیر داس، سور داس، گرونانک اور قدیم ہندی کے ہزار ہا لکھنے والوں کی زبان تھی۔ وہ اس ہندی کے مخالف تھے جسے عوام سمجھنے سے آج بھی قاصر ہیں اور انکے نزدیک یہ عمل زبان سے اس کے سماجی کردار کے چھین لینے کے مترادف تھا۔

جوش صاحب کا کہنا یہ تھا کہ اردو اور ہندی سے محبت ہندوستان کے کروڑوں انسانوں اور آئندہ نسلوں سے محبت کی دلیل ہے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے میں پورے ہندوستان نے قربانی دی جس کے وہ اپنے آپ کو دعویٰ دار نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ان کا یہ کہنا کہ کروڑوں ہندوستانی جن کی زبان اور ذہنی نشو ونما کا تنہا ذریعہ وہ زبان ہے جسے اردو اور کبھی ہندی کا نام دیا جاتا ہے اگر اس زبان کا غیر فطری ٹیڑھا، میڑھا استعمال ہم اپنے نئی نسل کو سکھائیں گے تو تقریباً آدھے ہندوستان کی ذہنی نشو ونما کی صلاحیت مٹی میں مل جائے گی۔ فرنگی حکومت کے مظالم کی داستان ایک طرف لیکن اس کی لعنت سے کہیں زیادہ خطرناک لعنت یہ ہوگی کہ زبان کی بیخ کنی کی جائے ذہنی اور دماغی ترقی کے اسباب پر قدغن لگا دیا جائے۔

جوش صاحب ہندوستان کی دوسری زبانوں مثلاً مراٹھی، تیلگو، ملیالم، بنگالی، گجراتی، دکنی اور یہاں پاکستان میں سندھی، پشتو، پنجابی کے مخالف نہیں تھے بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ کیا کسی زبان کا پاٹ اتنا چوڑا اور اس کا سینہ اتنا چکلا نہیں کہ کوئی ایک زبان اردو کی جگہ لے سکے۔ اور

وہ اردو اور ہندی کے خطے کی زبان بن جائے۔ پاکستان میں اردو زبان کو جو قومی زبان کا
رتبہ دیا گیا حالانکہ ایمانداری کیا تھا اسے وہ رتبہ نہیں ملنا چاہیے تھا کیونکہ اردو یہاں کے کسی خطے کی زبان
نہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی دوسری زبان اردو کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اس لئے اسے قومی زبان
کا رتبہ دیا گیا۔ لیکن اردو کے ساتھ " دستانے پہن کر" جو واردات یہ واردات کی جا رہی ہے
جوش صاحب اس کی وجہ سے ہمیشہ مضطر و پریشان رہے۔

ہمارے بہت سے جدید " ناقدان فن " جوش صاحب سے مختلف طور پر " شاکی اور
بدمزہ " رہے اس میں ان کا ایک " قصور " اردو زبان پر عبور سے بھی متعلق تھا۔ " جوش کی
شاعری " الفاظ کی بازیگری " ہے۔ " چھلکوں کا ڈھیر ہے " کھوکھلے الفاظ کا انبار ہے۔

ان میں تین طرح کے حضرات با صفات ہیں۔ ایک وہ جو زبان دانی اور لسانیات کو ایک ہی
میزان پر تولتے ہیں۔ مہذب دنیا کے افراد ان شخصیتوں پر نازاں ہیں جو زبان کا مرتبہ بلند کرتے اور
اس کے ہر لفظ اور ہر حرف کو روشنی کی طرح شفاف بناتے ہیں۔ اور اسے موتی کی آب دیتے ہیں۔ لیکن
یہاں معاملہ الٹا ہے۔

دوسرے وہ حضرات با صفات ہیں جو بقول جوش صاحب " قلم سے گلی ڈنڈا کھیلتے "
سینہ تان کر گلیوں میں نکل آئے ہیں اور ارباب اندیشہ، عقل کو گھروں کے دروازے بند کرنے پر مجبور
کیے ہوئے ہیں تاکہ زبان و موضوع کے معاملے میں ان کی بے بضاعتی پر کسی بڑے کی نگاہ نہ پڑ جائے
اور وہ محلے کے بچوں کے شور و غوغا میں اپنی خود عائد کردہ فضلیت کا کٹورا پی کر " لالہ و نسرین کو خاک
کے تودوں میں چھپا کر چین کی بنسری بجائیں "

ان میں تیسرا گروہ لسانی عصبیت پرستوں کا ہے۔ جنہیں اردو زبان اور جوش صاحب سے
اس لئے بیر ہے کہ کھڑی بولی کے دیس کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ لیکن جوش صاحب کے الفاظ میں
" اپنی زبان پر شرمانا اور غیر ملکی زبان انگریزی پر نازاں ہونا۔ کیا کسی آزاد، اور خود مختار انسان

کا شعار ہو سکتا ہے ؟ ''

دنیا کی ہر زبان کا خزینہ اس کے الفاظ ہوا کرتے ہیں۔ جو گھس کر اور منجھ کر ادب و شاعری کے ایوان میں داخل ہیں۔ شاعری کی دنیا میں جوش صاحب نے جو مینا کاری کی ہے اس کے بام و در کو حسن بخشا ہے۔ صرصر و سموم سے روغن غذا حاصل کر کے اردو زبان کا نیا تاج محل تعمیر کیا ہے۔ جو جھکڑوں اور آندھیوں کے باوجود جھلانے کا نام نہیں تھا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر صدیاں ناز کریں گی ایک ایک حرف کی قیمت کیا ہے اسے جوش صاحب سا معجز بیاں ہی بتا سکتا ہے۔

جوت ہیرے کی جگائے کوئلے کے رنگ میں
دامنِ طرزِ بیاں کو ڈوب دیتی رنگ میں
اوجِ معنی کو فروغِ کہکشاں دیتی ہوئی
بے زباں افکار کے منہ میں زباں دیتی ہوئی
ان کو لاکھوں خیرہ سر طوفان ڈھانے آئیں گے
ان سے لاتعداد اندھے زلزلے ٹکرائیں گے
ان پہ برسے گی مسلسل آگ، بھونچال، دھول، برف
پھر بھی لو دیتا رہے گا تا ابد ایک ایک حرف

یوں جوش صاحب کے حرف "گنجینۂ معنی کا طلسم" نہیں۔ بلکہ وہ ترسیل جذبات کا ذریعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کبھی الفاظ کے جادو کے اسیر نہیں ہوئے، بلکہ ان کے الفاظ، استعارے، تشبیہات۔ زلف

یہ سلسلۂ لا متناہی ہے کہ زُلف
گہوارہ بادِ صبح گاہی ہے کہ زُلف "
اے جانِ شباب دوش سیمیں پہ ترے "
ڈھلکی ہوئی رات کی سیاہی ہے کہ زُلف "

رنگ ، فضا اور مختلف کیفیات کی بھرپور علامتیں بن کر ظاہر ہوتی ہیں ۔ الفاظ کے ذریعہ وہ غیر مرئی کیفیات کو مجسم بنا دیتے ہیں ۔ الفاظ ان کے دستِ قدرت میں خام لوہا ہیں جیسے اور جس طرح چاہتے ہیں ؛ ایسے معنی اور مطلب پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔ ان کے میاں الفاظ گونجتے گرجتے ہی نہیں بلکہ صدا کو بھی گرفت میں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ موسیقی کا تعلق لبصارت نہیں بلکہ سماعت سے ہے ۔ جوش صاحب کا اسلوبِ بیان اور زبان پر قدرت کا معجزہ اسے ٹکڑے میں صرف سناتا نہیں بلکہ دکھاتا ہے ۔ ”موسیقی کا جزیرہ“ میں موسیقی کا بانکپن یوں کیفیات کو رقم کرتا ہے ۔

کانپتی ہیں انگلیاں مطرب کی جب مستانہ وار
راگنی کی آنچ سے جب نرم ہو جاتے ہیں تار
نغمۂ شیریں کا جب گرتا ہے رنگیں آبشار
دل کو چھو لیتی ہے اک موہوم سی باریک دھار
عشق کا جب نبضِ آہن میں مچلتا ہے لہو
لحن کے سانچے میں جب ڈھلتی ہے دل کی آرزو

اسی طرح ”آواز کی سیڑھیاں“ نیم سوریلسٹ نظم میں ہر لفظ کس طرح صاف روشن اور دھلا ہوا ہے اور کس طرح مختلف کیفیات کی ترسیل کا ذریعہ بنتا ہے ۔

کل جھٹ پٹے کے وقت کہ تھا زرد آفتاب
چھایا ہوا تھا عرصۂ ہستی پہ رنگِ خواب

یا

اتنے میں آئی پل کے صدائے طیور سے
بن کے کسی نگار کی اک تان دور سے

یا

نغمے کی نبضِ سرد مکرر تپاں ہوئی
گویا ٹھہر کے موج دوبارہ رواں ہوئی
پھر اس کے بعد تیز ہوئی تان دفعتہً
اللہ اے ایسے زور، گونج اٹھا گنبدِ کہن

اور اس کے بعد لحن کا دامن سمٹ گیا
اور یوں صدا کا زور بتدریج گھٹ گیا

گویا سفید، دودھ سی، پتھر کی سیڑھیاں۔ پتلی سبک، خنک، متناسب بہ شعر
تیشے سے زیر دیم کے ترش کر سنور گئیں
ساحل سے تا بہ نہر، مچلتی اتر گئیں

زندگی کی تصویر ملاحظہ ہو

مدرج بمدرج، دم بدم پیچ پیچ، خم بخم
دجلہ بدجلہ، یم بیم، تند عناں ہے زندگی
کوہ بکوہ، جو بجو، قریہ بقریہ، کو بکو
رنگ برنگ و بو بہ بو موج رواں ہے زندگی
جزو بجزو کل بکل، خار بخار، گل بگل
شیشہ بشیشہ، مل بمل بادہ فشاں ہے زندگی
نوش بنوش، سم بسم، جرعہ بجرعہ، دم بدم
جام بجام، جم بجم، پیرِ مغاں ہے زندگی
جوشش کا دم ہے واپسیں لا بھی شراب ساتگیں
دیر نہ کر کہ ہم نشیں، آب رواں ہے زندگی

الفاظ ساتوں کا رشتہ بجائے خود ایک تخیلی عمل ہے۔ یعنی فنی تخلیق کے عمل میں مشاہدہ۔ تجربہ، جذبہ، فکر سب مل کر "خون جگر" کی نمود پیدا کرتے ہیں۔ لیکن قدرت بیان تخلیق میں کرن ٹانکتی ہے اسے نک سک سے درست کرتی و مانجھتی اور چمکاتی ہے کسی ادیب کو اگر قدرت بیان نہیں تو تخیل کی بڑائی کے باوجود اس کی تخلیق کھردری رہے گی۔ وہ ترتیب عمل پیدا کرنے کے بجائے سرسری گذرنے پر مجبور کریگی جس موضوع کو ڈرائیڈن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ

الفاظ ہمارے خیالوں کی تصاویر ہوتے ہیں words are pictures of thought کا خیال ہے کہ "الفاظ خیالوں کے پیرہن ہوتے ہیں۔ غالب نے لفظ و معنی کے اسی رشتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

جوش صاحب نے کہا "الفاظ سواریاں ہیں خیالات کی"۔ "لافانی حروف" میں اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے۔

لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں انگلیاں ذہن خالق کی حکایت زندگی کی داستان
جوت ہیرے کی جگاتے کوئلے کے انگ میں دامن طرز بیان کو ڈوب دیتی رنگ میں
دائروں میں بند کرتی گیسوؤں کے پیچ و خم
سسکیوں کی تھرتھراہٹ زمزموں کا زیر و بم

ذہن کے دھارے کو ساحل کا سکوں دیتی ہوئی نرم پوروں سے ادب کی کشتیاں کھیتی ہوئی
دل کے خون تازہ کی بوندوں کو ٹپکاتی ہوئی روئے قرطاس و قلم پر پھول برساتی ہوئی
ان پہ برسے گی مسلسل آگ پھوبل دھول برق
پھر بھی لو دیتا رہے گا تا ابد ایک ایک حرف

خون کی گردش میں رہ رہ کر برنگ زیر دبم

حوصلوں کی بے قراری ولولوں کا پیچ و خم

شعر وادب کو بڑھانے اور اس میں وسعت وگہرائی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زبان عوام سے نزدیک لائی جائے۔ یہ فنکار کی بزرگی و برتری کی دلیل ہے کیونکہ جتنا ہی فن ترقی کے منازل طے کرتا ہے اور حقیقت سے قریب آتا ہے۔ اتنا ہی وہ اپنے ماحول، کردار کی فنکارانہ تخلیق اپنے عہد کی زبان میں کرتا ہے ... پریم چند کی بڑائی یہی ہے کہ ان کا ہر کردار جس ماحول سے آتا ہے وہی زبان بولتا ہے۔ اردو اور ہندی ہندوستانی زبان کے دو ادبی روپ ہیں چنانچہ ہندوستان کے دیہات کی اکثریت چونکہ ہندی زیادہ بولتی ہے اس لئے ان کا "گئودان" ہندوستان کی روح کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا اردو زبان میں کی لیکن جوں جوں وہ عوام سے دور ہوتے گئے توں توں انکی زبان فارسی آمیز ہوتی چلی گئی۔ یہی دشواری جوش صاحب کی بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری میں روزمرہ کو بہت ہی سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ ان کی مشہور اور معرکتہ الارا نظم " وقت کی آواز"، اس کا ثبوت ہے۔ خالص سیاسی اور ثقافتی موضوع پر اتنی بحر ذخار نظم عورتوں کی ٹھیٹھ زبان میں لکھنا الفاظ کی نس نس سے واقفیت کی دلیل ہے۔ جوش صاحب کی شخصیت میں چونکہ عرب وعجم اور گنگا جمنا دونوں کی آمیزش ہے ان کے یہاں روزمرہ کا استعمال ہوا تو یقیناً ہے لیکن فارسی کے اثرات ہر طور جھلکتے ہیں۔

یہاں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ عام طور پر جو ادیب وشاعر ہندی کے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں ان کے کلام کو عوام سے قریب اور جو دقت طلب الفاظ استعمال کرتے ہیں انہیں دقت پسند کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات غالباً صحیح نہیں ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ اگر شاعر اپنے تجربات کو انتہائی سہولت سے بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور بے ساختگی سے اپنے موضوع کو

بیان کرتا ہے تو خواہ وہ عشقیہ مضامین ہوں یا فلسفیانہ اس کے لئے دونوں قسم کے مضامین لئے جا سکتے ہیں ۔ ترسیل وابلاغ لازمی شرط ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ جوشؔ صاحب نے معاشرے کے ہر رخ کی عکاسی کی ۔ اس کی درستگی و نادرستگی کا جائزہ لیا ۔ محنت کش اور بالائی طبقات کے ٹکراتے ہوئے مفادات پر روشنی ڈالی ۔ ان کے کلام میں لہجے کی تراش ، تپاہوا انداز فکر ، معجزانہ قدرت اظہار موجود ہے ۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کی زبان کی رسائی متوسط طبقے تک محدود ہے ــــــ اس ضعف کا شکار ہمارے بیشتر ترقی پسند شاعر وادیب ہیں ــــ جنھوں نے اپنے خون جگر سے انقلاب کی "حکایات خونچکاں" کو مرتب تو کیا ۔ لیکن زیادہ تر طوفان سے دور ساحل پر کھڑے ہوکر ۔ عوامی زندگی کے سیلاب میں نہ پیرنے کی وجہ سے ان کا کلام آج بھی عوام سے دور ہے اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جوشؔ صاحب ، فیضؔ صاحب اور دیگر ترقی پسند ادیبوں کا رشتہ مقامی بولیوں مثلاً اودھی ، برج ، پوربی ، سندھی ، پشتو ، وغیرہ سے استوار نہیں ہو سکا ۔ ظاہر اس کمزوری کی تاریخی وجہ ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبان و بیان جڑوں میں اپنی جگہ نہیں بنا سکی ۔

لیکن اس خامی کے باوجود یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جوشؔ صاحب فکر و نظر کی دنیا میں رزاق تہذیب ہیں ۔ ان کی زبان کا حسن صدیوں کے اجتماعی عمل کا تعطر ہے جو ادزاروں کی چوٹ کھا کر کندن بنی ، الجھنوں کے زیر و بم سے گذرتی جس تے تہواروں کو روشنی دلائی اور ڈہی گیتوں سے اگلتا ہوا سونا بنی کوئل کے کلیجے کی ہوک سنی ، کنوارے ہونٹوں کی ہلاوٹ چکھی ، جسموں کے رقص و رنگ میں جھومی منجمد رنگوں میں بجلی کا کرنٹ بنی ، تاریکی کے جنگل میں چاندنی کی مسکراہٹ پھیلانے اور بصیرت و بصارت جلانے کے لئے جہاد کرتی رہی ۔

انقلاب (فکری پہلو)

انقلاب کے معنی کیا ہیں؟ اسباب و علل کے رشتے تاریخ میں کس طرح پیوست ہیں۔؟ جوش نے آزادی و انقلاب کی جد وجہد میں کن تصورات ونظریات سے اپنی فکر کو ہم آہنگ کیا؟ اس بحث میں جانے سے قبل برصغیر کے مزاج اور یہاں کے مختلف مکاتیب فکر کے افکار پر سرسری نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

ہندوستان کا تمدن قدیم و پر تپسیج ہے۔ مختلف تمدنوں کی آویزش اور باہمی اختلاط سے اس کا خمیر اٹھا ہے۔ رواداری اس کا مزاج، تھم تھم کے پگھلنا اس کی سیرت، پھوار بن کر برسنا اس کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ باہر سے آنے والوں نے اس پر سنگ باری بھی کی اور تیغ زنی بھی۔ لیکن رنگِ جلد بدن اور رنگِ سوزِ گلو سے لاپرواہ زمین ہمیشہ محبت کی لو دیتی رہی۔

ہند کے ذات پات کے نظام نے برہمن کو فیل مست بنا دیا تھا۔ کھڑی کھیتیاں روندی گئیں تھیں۔ انسان بے سہارا ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں مہاتما بدھ کی فکر کی چاندنی چھٹکی جس نے عام انسانوں کی دستگیری کی۔ ذات پات کے نظام پر ضرب کاری لگی۔ سنسکرت کی جاگیر ٹوٹی۔ ابھرنش نے پراکرتوں کو جگمگا سرٹ بخشی۔ زمین ٹھنڈی ہوئی۔ محبت کی لے بڑھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہندوستان کا social structure ہمیشہ کے لئے تبدیل ہو جائے گا۔ لیکن ساتویں صدی کے آتے ہی آتے بدھ ازم کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور برہمن ازم کو پھر فروغ ہوا۔

ایسے وقت میں مسلمان اسلام کی "سادہ و رنگین" وراثت لے کر ہند کی دھرتی پر آئے۔ عرب، ترک، افغان بھی آئے۔ محمد بن قاسم نے خیمہ زنی اور شمشیر زنی کے جوہر دکھائے۔ سندھ کی شانتی و محبت کی لہلاتی کھیتی بدھسٹوں کی مدد سے کاٹی۔ برہمن راجہ داہر کو ۷۱۲ - A - D میں شکست دی۔ مسلمان جنوبی ہند میں اترے۔ اسلامی مساوات، اخوت اور برابری کے تصورات نے مقامی آبادی کو متاثر کیا۔ رشتے گہرے ہوئے۔ اسلام نے گو "خانقاہی" کے خلاف علم

علم بغاوت بلند کیا تھا۔ لیکن ہندوانہ لوجا کے انداز مسلمانوں نے بھی قبول کئے۔ امام باڑوں کی سجاوٹ ہندوانہ طرز پر ہوئی۔ کشف و کرامات کی مخالفت اسلام میں اپنی جگہ تھی لیکن پنڈتوں سے متاثر ہو کر مولویوں کی آؤ بھگت کی گئی۔ عوامی سطح پر، نانک، چشتی، تلسی داس اور کبیر نے زمین کو پیار کی شبنم سے سینچا۔ مغل شہنشاہیت کا جھاڑ روشن کیا۔ گو مطلق الالعنانیت لعنتوں کا طوق پہنے تھی۔ عوام بلا تفریق مذہب غیر قانونی محصولوں کے تحت پس رہے تھے۔ "العوام کالانعام" کی ریت تھی۔ لیکن بالائی سطح پر ہندو اور مسلمان تہذیبیں گلے مل رہی تھیں۔ دونوں تہذیبیں ہاتھوں میں گجرا باندھے، مانگ میں صندل اور سیندور لگائے، ہاتھوں میں کنگن و کڑے پہنے کھڑی تھیں۔

مہندی تمہارا لال رچے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

انیسؔ

اکبر، جہانگیر، داراشکوہ، ابو الفضل اور فیضی نے ہندو مسلم متحدہ تہذیب کی گلاب باڑی لگائی۔ جس کی خوشبو تہذیب کے ہر رنگ میں نمایاں ہوئی۔ متحدہ قومیت کا کارواں آگے بڑھنے لگا۔

انگریزوں کی آمد سے ہندوستان ایک نئی صورتِ حال سے دو چار ہوا۔ وہ تاجر بن کر آئے لیکن امربیل کی طرح یہاں کی معیشت و سیاست پر چھا گئے۔ حکمرانی کی نئی بساط بچھی۔ شطرنج کے مہرے لگے۔ چالیں چلی جانے لگیں۔ انگریزوں نے حکومت کو مسلمانوں سے چھینا تھا۔ اس لئے خطرہ بھی انہیں سے زیادہ تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو ذہنی اور جسمانی طریقے پر کچلنے کی سازشوں کا آغاز ہوا۔

۱۔ مسلمانوں کی تاریخ نئے عنوان سے لکھی گئی۔ ظالم و جابر سلطانوں کی کہانیاں لکھی گئیں جس کا مقصد مقامی اکثریت کو یہ باور کرانا تھا کہ "انگریز نجات دہندہ ہند ہے"۔

۲۔ دوسری چال یوں چلی گئی کہ مسلمان اقتصادی و سیاسی طور پر فالج زدہ ہو جائے۔

بنگال میں permanent settlement ہوا۔
مسلمان "اقتصادیات" سے بے دخل ہوا۔ زمین کی "حفاظت" کیلئے "وفاداروں کا طبقہ"
وجود میں لایا گیا۔ جو انگریز کے ایک اشارے پر زمین کو اجاڑنے کے لئے تیار تھا۔

۳۔ مغل شہنشاہیت نے فارسی زبان کو مقامی زبانوں کے ساتھ فروغ دیا تھا۔
قومی زبان فارسی تھی۔ کاروبارِ حیات اسی کے ذریعہ چل رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اسی
زبان کے رسیا تھے۔ عجم سے رشتے گہرے تھے۔ انگریزوں نے بساط الٹ دی۔ فارسی کی
جگہ انگریزی زبان کی سامراجیت قائم کی گئی۔ لارڈ میکالے نے حقِ نمکِ برطانیہ ادا کیا۔ اس کی
ریت پر عمل کرتے ہوئے ہمارے حکمران لارڈ میکالے کو پیمبر و دیوتا کی منزل پر رکھکر اپنا خراج آج
بھی پیش کر رہے ہیں۔

۴۔ انگریزوں کی مسلمان دشمنی ۱۸۵۷ء میں اپنے عروج پر پہنچی۔ گو اس جنگِ
آزادی میں ہندو و مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ لیکن چونکہ اس جنگ کی علامت مغل
شہنشاہ تھا۔ اس لئے مسلمانوں پر ضربِ کاری لگائی گئی۔ ۲۷ ہزار مسلمان ایک رات میں
موت کی نیند سلا دیئے گئے۔

غرض اٹھارویں صدی کے اوائل اور انیسویں صدی کے وسط تک مسلمان انگریزوں
کا نشانہ بنے رہے اور اس لئے وہ انہیں اپنا جانی دشمن اور خطرے کا نشان تصور کرتے رہے۔

لیکن انیسویں صدی کی دو دہائیوں میں انگریزوں نے چالوں کا رخ ہندوؤں کی
جانب پھیر دیا۔ مسٹر ہیوم کی سرکردگی میں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ انگریز
دشمنی اور جمہوری حقوق کی لے بڑھی۔ مسلمان بھی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ متحدہ قومیت کا
اصول اپنایا گیا یہ تجویز منظور کی گئی کہ "جس تجویز کو کانگریس کے مسلمان ڈیلیگیٹ کی اکثریت
اپنی ملت کے حق میں مضر سمجھے اس پر سالانہ اجلاس میں بحث نہ کی جائے"۔ ان دو باتوں سے
سرکاری حلقوں میں زلزلہ آگیا۔ چنانچہ سر آکلینڈ گورنر صوبہ متحدہ نے ہیوم کو لکھا کہ چونکہ کانگریس

نے انگریز دشمنی سے کام لیا ہے اس لئے ہم سرسید اور دیگر مسلمانوں کے ذریعے اس کی روک تھام کریں گے۔ "مسلمان خطرہ ہیں" یہ ڈر انگریز کے دل سے نکل گیا۔ اب متحدہ قومیت کا پلیٹ فارم انڈین نیشنل کانگریس انگریز کے لیے خطرۂ عظیم بن گئی۔ اسے اس ہندوستانی متوسط طبقے کے وجود میں خطرات کا سمندر موجیں مارتا نظر آنے لگا۔

۱۹۰۵ء ایشیا کی تاریخ کا عظیم باب ہے۔ روس کی سرزمین نے سرمائے کی لعنت کا طوق اتارا۔ عوام کو کھلے اختیارات ملے۔ محنت کا سر غرور سے دمک اٹھا۔ جاپان اور پھر ایشیار کے مسلم ممالک بھی نیند سے جاگ اٹھے۔ اس موقع پر برطانیہ اور زار روس نے اپنی رقابتوں، رنجشوں اور غباشتوں پر پانی ڈالا۔ نئے منصوبے وضع کئے، "حلقۂ اثر" بڑھانے کی چالیں چلی جانے لگیں۔

ہندوستان بھی انقلاب کی زد پر آیا۔ انقلابی تحریکوں کا جال بچھا۔ "مراعات" کی لے کجلائی۔ بم کے دھماکوں نے انکی جگہ لی۔ عبید اللہ سندھی نے آگے بڑھ کر جامِ آزادی نوش کیا۔ متحدہ قومیت کے دامن میں چراغاں ہوا۔

انقلاب کے بڑھتے ہوئے اثرات اور متحدہ قومیت کے چراغاں سے گھبرا کر انگریزوں نے ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا خنجر پیوست کیا اور "ہندو پانی" اور "مسلمان پانی" کا خط کھینچ دیا۔

مسلمانوں کا رویہ انگریز کی طرف ابتدا ہی سے جارحانہ تھا۔ انگریز دشمنی نے ان کے دلوں میں مذہبی عقیدے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن مسلم رہنما شاہ عبدالعزیز نے فرنگی سیاست کا مقابلہ "سیاست کے بجائے شریعت محمدی سے کیا۔ برطانوی علاقوں کو دارالاسلام کی تعریف سے خارج کیا اسے دارالحرب قرار دیا۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید انگریزوں کے بجائے سکھ حکومت سے ٹکرائے اور شہید ہوئے۔ یعنی مسلمان فقہا نے ہندو مسلم صف بندی اور متحدہ قومی جدوجہد کو آگے بڑھانے اور سیاسی و سماجی حالات کا تجزیہ کرنے کے بجائے سکھوں سے جنگ کی اور اصلی دشمن یعنی انگریز کی چالوں کو نہ سمجھ سکے۔ یہی فکری افلاس

آج بھی ہمارے حکمرانوں اور علما میں جاری و ساری ہے۔ یوں مسلمان انگریز دشمنی کے باوجود برطانوی سازش کے شکار ہوئے۔ نتیجے میں برطانوی حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔

سرسید جدید ذہن کے انسان تھے۔ لیکن حالات کے اسیر تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی انگریز دشمنی کے جذبے کو سرسید نے پگھلایا۔ انہوں نے مغربی افکار سے محبت کے علاوہ انگریزوں سے محبت کرنے کا بھی درس دیا۔ انگریزوں کے خلاف متحدہ قومیت اور قومی جدوجہد کے ہاتھ مضبوط کرنے کے بجائے آل انڈیا "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کی داغ بیل ڈالی۔ کھجور اور ہلال کے ساتھ برطانوی تاج کو بھی علی گڑھ کالج کے نشان میں داخل کیا گیا۔ "امامت و خلافت" جیسے گھسے پٹے مباحث کا آغاز ہوا۔ انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ مسلمانوں کے مزاج کو سمجھتے ہوئے ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کو "تحفہ عظیم" عطا کیا۔ "مسلم لیگ" وجود میں آئی۔ آغا خان نے "جداگانہ انتخاب" کی مانگ کی۔ آئینی اصلاحات کے پردے میں مسلمانوں کو نوازنے کی پالیسی کا آغاز ہوا۔ یوں contact assimilation and synthesis کا تاریخی عمل روک دیا گیا۔

ہندوستانی متوسط طبقے نے انگریزوں کی طرف نیا انداز اختیار کیا۔ ایک طرف اس نے انگریزی تعلیم کو اپنایا۔ کلکتے، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ انگریزی تعلیم اور مغربی افکار سے قوم کو روشناس کرایا گیا۔ دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس سے جڑ کر انگریزوں کے خلاف جہاد میں شامل رہے۔ ہندوستانی بورژوا طبقہ مسلمان بورژوا طبقے کو ۵۰ سال پیچھے چھوڑ کر ہر سمت میں آگے بڑھ گیا۔ مسلمان صرف "مسدس" لکھتے اور ماضی کی کہکشاں سے اخذ مسرت کرتے رہے۔

اس پس منظر میں اب یہ سوچنا ضروری ہے کہ آیا امامت و خلافت، سرسید کی علی گڑھ تحریک اور مسلم لیگ کی سیاست سے جڑ کر چلنا وقت کی ضرورت تھی؟ یا یہ سوچنا لازم تھا کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر کون سی سیاسی اور سماجی قوتوں سے رشتہ جوڑا جائے۔ جن کی مدد

سے برطانوی سامراج سے نجات حاصل کی جا سکے۔ ظاہر ہے اس وقت متحدہ قومیت ہی منزلِ مراد تک پہنچانے کا واحد راستہ تھی۔

اس پس منظر میں اگر جوش کے افکار کا مطالعہ کیا جائے تو بات یہاں سے شروع کی جا سکتی ہے کہ انکی فکر نے نت نئے تجربات کیے۔

حیدر آباد میں۔ زندگی کا ہر گوشہ روشن ہوا۔ لیکن ریاستی جبر، اس کی غلامانہ خو لو اس شعلۂ بے باک کو زیادہ دیر پناہ نہ دے سکی۔ سیاہ رات روشنی کے سامنے تلملا اٹھی۔ شاہی عتاب نازل ہوا۔ جوش نے ریاست کو خیر آباد کہا۔ احساس پر چوٹ پڑی۔ فکر نے کروٹ بدلی۔ پہلے اپنی ہی ذات مرکزِ توجہ اور اپنا ہی غم سب سے بڑا نظر آتا تھا۔ لیکن اب ساز نے لے بدلی۔ ریاستی جبر نے ذات کے خول سے باہر نکلنے اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو سمجھنے کا مواد فراہم کیا۔

جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ ہونے کے ناطے اُس وقت جوش اگر اپنے طبقے کے مفادات کے پیشِ نظر ریاستی نظام اور پھر برطانوی سامراج سے "بنا" کر رکھتے تو تعجب نہ ہوتا۔ "سر" کا خطاب نہ سہی دوسری مراعات حاصل کر کے اپنی جھولی بھرتے تو مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ یعنی برطانوی سامراج اور اس کے طفیلی طبقے سے بغاوت کا راستہ اپنایا۔

اس وقت آزادی کے حصول کیلئے بنیادی شرط متحدہ قومیت کے تصور کو بڑھاوا دینا تھا۔ جس کے گرد مذہبی تنگ نظری حصار کھینچے ہوئے تھی۔ بالائی قوتیں اپنے طبقاتی مفادات کے پیشِ نظر اس راگ میں شامل اس لے کو بڑھاوا دے رہی تھیں۔ برطانوی سامراج اسے ہوا دے رہا تھا۔ چاروں طرف کڑی دھوپ پڑ رہی تھی۔ گلاب کی پتیاں بکھر رہی تھیں۔ سامراج زمینداروں اور فتویٰ فروشوں کو بچانے کے لئے اپنی مجموعی طاقت کے نشے میں جذبۂ حریت کو دولتیاں مار رہا تھا۔ آوازِ حق طوق و سلاسل میں مسلسل پکار رہی تھی۔ دانش کو درے

لگائے جا رہے تھے۔ ذہنوں میں نفاق کی فصل تیار کرنے کیلئے نئے قوانین کے ناگ چھوڑ دیئے گئے تھے۔ جہل کے ریگزار میں مولوی اونٹ کی طرح بلبلا کر فضا کو مسموم کر چکا تھا۔

شاعری شخصیت کا پر تو ہوتی ہے اور شخصیت میں حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنی ذات میں اعلیٰ صفات جیسے شجاعت و بہادری، حق گوئی اور بے باکی اور تزکیۂ نفس کو پیدا کرتا ہے۔ ان صفات کو ایک اعلیٰ مقصد و مسلک کے تابع کرتا ہے اور مقصد کے حصول کے لئے آگ و خون کے دریا سے گذر کر کندن بن جاتا ہے۔ مقصد کی جھلک خواہ مصرعوں کی لڑی میں ہو۔ سنگتراشی کے مجسمے، تصویر کے درخشاں باب اور نغمۂ آتشیں کی لپک میں ہو۔ دراصل فنکار کے شعور کا عکس ہوتا ہے۔ شعور خواہ کتنا ہی اچھوتا، آبدار، ہمہ گیر اور ہمہ جہت کیوں نہ ہو اپنے عہد کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ سامراج اور تنگ نظری کے ناگوں کے ہاتھوں ستم زدگان کے خوابوں کو پریشان دیکھ کر جوش کے احساسات پر چوٹ پڑی۔ احساس فرض شناسی نے انہیں اس طرح آواز دی۔

تڑپ کے مجھ کو پکارا ہے ملک و ملت نے
اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں
تغیرات کی زد سے گذر رہی ہے نگاہ
اب اہتمام تماشائے حسنِ بام کہاں
لب حیات نے چھیڑا ہے قصۂ ہے خونیں
مری زبان کو اب رخصتِ کلام کہاں
"ترک جمود"

دوسری طرف جوش متحدہ قومیت کے راہ کے جھاڑ جھنکار آزادی کے کارواں کے لئے صاف کر رہے تھے۔ 'مولوی' 'فتنۂ خانقاہ' "ذاکر سے خطاب" جیسی نظمیں تنگ

نظری ۔ فرقہ واریت اور سامراج پر کھلا وار ہیں ۔

سوچ تو اے ذاکرِ افسردہ طبع و نرم خو — آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤ ہو — فلس کا دریوزہ ہے منبر پہ تیری گفتگو
عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خونِ اہل بیت میں لقمے کو تر کرتا ہے تو

کربلا سے واقفیت بھی ہے مردِ منفعل — کربلا در پردہ بشاش اور بظاہر مضمحل
جس کی رفعت سے بلندی آسمانوں کی خجل — جسکے ذروں میں دھڑکتے ہیں جوانمردوں کے دل
خندہ زن ہے جس کی رفعت گنبدِ افلاک پر
مہرِ تکمیلِ نبوت ثبت ہے جس خاک پر

" ذاکر سے خطاب "

" فتنۂ خانقاہ " میں فقیہانِ حرم کی " دلداریوں " کی داستان یوں رقم کی ۔

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ — پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ — ہونٹوں پہ دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ
برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا — ایماں دلوں میں لرزہ بر اندام ہو گیا
زاہد حدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے — انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے — کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصہ دین، کفر کا دلوانہ ہو گیا — کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

جوش کو یقین تھا کہ فرقہ واریت کا زہر " آزادی کی نیلم پری " کے جسم پر نیلی ڈال دے گا ۔ متحدہ قومیت کے ذریعے ہی برطانوی سامراج سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور آزادی کا حقیقی چہرہ چمک سکتا ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں ۔

"اے مورکھ ہندو۔ اے نادان مسلمانوں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم نے جو تفریق کی چھیٹیاں اپنے اپنے ماتھوں پر چپکا رکھی ہیں انہیں جھڑ اڈالو۔ . . . . اپنی فرضی قرابت داریوں کو اس مقدس و عظیم قرابت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دو جو حقیقی و فطری ہے . . . . دیکھو اب بھی زہر پورا نہیں چڑھا ہے . . . . اب بھی سویرا ہے۔ آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو جاؤ کہ دنیا کی کوئی ضرب تمہاری محبت کے بہتے ہوئے پاک دھارے کو پھاڑ نہ سکے . . . ."

اشارات

۱۶ تا ۱۰۹

دوسرے مقام پر فرقہ پرستی کو یوں للکارتے ہیں۔

بازوئے زر۔ ناخدائی کے لئے تیار ہو
ڈوبنے والی ہے کشتی قوم کی ہشیار ہو

اور مسلمانوں کو یوں سمجھاتے ہیں۔

ہاں خود زدہ بھی تو ہے اسلام کا زیور
باندھے گا فقط جامۂ احرام کہاں تک

اور اتحاد و اتفاق کی یوں تلقین کرتے ہیں۔

توڑ اس جال کو جکڑے ہے جو بازو تیرا
بستۂ کش مکش سبحہ و زنار نہ بن
پست سے پست ہو جو چیز وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن

آزادی کی تحریک میں فرقہ پرستی کا پانی نہ سٹھنے پائے۔ یہ فکر جوش کو بے چین کئے تھی۔ متحدہ قومیت کا کارواں آزادی کے نعرے لگاتا جب آگے بڑھنے لگا تو برطانوی سامراج کے ایجنٹوں نے کانپور میں فرقہ واریت کے شعلے بھڑکا دیئے۔ اجالوں کو سیاہی نے نگل لیا۔

انسانوں کو تعصب کے ہاتھوں اپنے ہی لہو میں غلطاں دیکھ کر جوش کا قلم یوں خون کے آنسو بہا رہا تھا۔

ہاں تو ہی ہے وہ جنوں نے جس کے ٹکڑے کر دیا
سبحہ و زنار کی الجھن میں رشتہ قوم کا
سوچ غیرت ڈوب مر، یہ عمر، یہ درس جنوں
دشمنوں کی خواہش تقسیم کے صید زبوں
یہ ستم کیا اے کنیز کفر و ایماں کر دیا
بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا
کر دیا طولِ غلامی نے تجھے کو تہ خیال
جھریاں ہیں یہ ترے منہ پر کہ غداری کی چال
چہرۂ امروز ہے میرے لئے ماہِ تمام
خوفِ فردا ہے مری رنگیں شریعت میں حرام
حبِ انساں، ذوقِ حق، خوفِ خدا کچھ بھی نہیں
تیرا ایماں چند رسموں کے سوا کچھ بھی نہیں
کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لاؤں تو سہی
اک نیا سنگم زمانے میں بناؤں تو سہی

"نعرۂ شباب"

شعلہ صفت شاعر کا قلم اس طرح انگارے برسانے لگا۔

تیری جانب اٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ

سبحہ و زنار میں جکڑے ہوئے دلو سیاہ

تو ابھرتے ہی زمانے کی نظر سے گر گیا

یوں بہایا خون امیدوں پہ پانی پھر گیا

اٹھنے ہی والا ہے آزادی کا جال پر ور جہاد

اے فرنگی شادماں باش و غلامی زندہ باد

"مقتل کانپور"

انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں فضا میں فرقہ پرستی کا زہر گھولا جا چکا تھا۔ برطانیہ اپنی حکمت عملی میں کامیاب تھا۔ لیکن جمہوری جد و جہد پھر بھی آگے بڑھ رہی تھی۔ عوام کا غم و غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کا عمل شعلہ رفتار تھا۔ "ہندوستان کی تحریک آزادی کے مد و جذر کو سمیٹ کر جوش اردو شاعری میں پہلی مرتبہ "mili kaml" شاعری کی داغ بیل ڈال رہے تھے "ترقی پسند ادب۔ ـــــــ تحریک آزادی کی ہر کروٹ اور ہر شکن سے انکی شاعری جڑی ہوئی تھی۔ جس کا ہر لفظ رجز پڑھ رہا تھا۔ ہر سطر جرأت کی کہانی تھی اور ہر مصرعہ ستون دار پر لہو کا چھاڑ کھلا رہا تھا۔

لوٹتے پھرتے تھے تم جب کارواں در کارواں

سر برہنہ پھر رہی تھی دولت ہندوستاں

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلم بے پناہ

آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہوگا وہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی

یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب۔"

جوشؔ کی حقیقت نگر آنکھ سیاست کی سنگلاخ چٹان کے اندر جھانک کر ذی شعور، بیدار مغز، اور بلند حوصلہ عوام کے سیماب صفت عمل کا جائزہ دے رہی تھی ۔ وہ بن کھلی کلیوں کا کھلنا دیکھ رہی تھی ۔ انگریزوں نے قلعہ کی دیواروں کو بلند کر دیا تھا۔ اس خوف سے کہیں کوئی "قیدی" زنداں سے فرار نہ ہو جائے ۔ لیکن ہمالہ صفت عوام کے حوصلوں کو پانا حکومت کے بس میں نہیں تھا ۔ ساز کی جھنکار "نئے سرچیم" کا پتہ دے رہی تھی۔ ہندوستان کے عوام جس آہنی دھمک، جرأت و بے باکی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ موج در موج آزادی کا کارواں جس طرح بڑھتا جا رہا تھا۔ جوشؔ نے عوام کی اس شعلہ سامانی کو اپنی اس معرکۃ الآرا نظم میں اس طرح سمیٹ لیا تھا

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے۔ گونج رہی ہیں تکبیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
آنکھوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کے سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا

تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا انکو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے

اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے

اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

"شکستِ زنداں کا خواب"

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ

اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ

اے گداپیشوں کے سلطان جاہلوں کے تاجدار

بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار

اے رئیس پاک دل اے شہریار نیک نام

بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجے سلام

تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک ہیں دو روٹیاں

شکریہ ان روٹیوں کا اے شہ گردوں نشاں

صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام

کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام ؟

آپ کے سر پر تاج، اے فاتحِ روئے زمیں

اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں

کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگام خوب

کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ

آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

ہم وفا داران پیشیں ، ہم غلامان کہن

تجر جن کی کھد چکی تیار ہے جن کا کفن

تند رو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں

نوجوانوں کی امنگوں کو دبا سکتے نہیں

چونکیے جلد ہی ہوائے تند وگرم آنے کو ہے

ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

۱۹۱۷ء کے روس کے عظیم انقلاب کا اثر ہمہ گیر سامراج دشمن جذبے کی صورت میں دنیا پر مرتب ہوا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی پر بھی اس کے مثبت اثرات نمایاں ہوئے۔ طبقاتی تضادات کے گہرے ہونے کے نتیجے میں طبقاتی شعور نکھرا۔ بعض انتہا پسند حلقوں میں بالشویک اور روسی نراجی پارٹیوں کے فلسفے کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ مزدور انقلاب کے نقشے بنائے گئے۔ باوا سوہن سنگھ نے مجاہدانہ تنظیمیں بنائیں۔ آزادی کی تحریک دریا کی باڑھ، آبشار کا شور، اور جھکڑ بنا۔ قافلۂ عشق آگے بڑھا۔ "جلیان والا باغ" کی گلاب باڑی لہو میں ڈوب گئی اصلاح پسندی کے کلیدی لفظ نے حقیقی آزادی و انقلاب کو گلے لگایا۔ برصغیر کی آزادی ایشیا و افریقہ کی بیداری کا حصہ بن گئی۔ انقلاب کی ضرورت ہر گوشۂ زندگی میں محسوس کی جانے لگی۔ جوش نے عصر حاضر کی آواز کو یوں سمیٹ لیا۔

" خدارا اپنے ادب و سیاست میں عظیم انقلاب پیدا کر کے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خوں آشام دانتوں سے چھڑا لیجیے ورنہ کشتی ڈوب جائے گی، شباب و محبت کا واسطہ ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑائیے . . . . نیا باب الہند، تیار کیجیے۔ یاد رکھیے ایک جنبش قلم، ہزار برہنہ تلواروں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے۔

"اشارات"

صد ۶۹

جوش کا قلم ہندوستان کی آزادی کی تحریکوں سے جڑا ہوا شعلہ فشانی کر رہا تھا۔ وہ ذہنی سفر کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ لیکن ان کے فکر و فن میں انقلابی تبدیلی ۱۹۳۵ء میں آنا شروع ہوئی۔ یہ عہد عالمی اقتصادی بحران کا تھا۔ اس بحران کی وجہ سے ہندوستان کی معیشت کے تار و پود بکھر رہے تھے۔ انتشار ہی انتشار تھا۔ فاشزم کے ہاتھوں یورپ آگ و خون سے گذر رہا تھا۔ تھامس مان ، ہنرانک مان ، فرائڈ اور آئن سٹائن ملک بدر تھے۔ مسولینی حبشہ پر حملہ کرنے کے بعد چاروں طرف انسانیت کی ہڈیاں چبا رہا تھا۔ برطانیہ اور فرانس اس کے پشت پناہ تھے۔ ان حالات اور واقعات کی چھوٹ مشرق پر بھی پڑ رہی تھی۔ ہندوستان بھی شعلوں کی آنچ کو محسوس کر رہا تھا۔ نتیجے میں حریت پسندوں کے آزادی کے ترانوں میں زیادہ توانائی پیدا ہوئی۔ کشتیوں میں بھوک اگتی دیکھ کر انقلابی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ یورپ میں نوجوانانِ ہند " انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ شاخیں بار آور ہو رہی تھیں۔ بیج ہندوستان میں بھی ڈالا جا چکا تھا۔ اشتراکی نظریات جڑ پکڑ چکے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے دامن میں موتی رل رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک ہمہ گیر تھی جو لہو کی گردش کی طرح برصغیر کی رگ و پئے میں دوڑ رہی تھی۔ اس تحریک نے سیاست و ادب کے بازؤں میں سیسہ پگھلایا۔ سینوں کو آہنی عزم دیا۔ اور انقلاب کو نشانِ منزل بنایا۔ حضرت جوش اس تحریک کے میر کارواں تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انجمن کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے یہ زریں و درخشاں الفاظ رقم کیے۔

" سینۂ ہندوستاں میں انقلاب کا جو سرخ شعلہ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہا تھا۔ اسے ہوا دینا شروع کیا جائے۔ انقلاب ، انقلاب ، زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب ، آداب و رسوم میں انقلاب۔ نظریات و معتقدات میں انقلاب ، مسلمات و کلیات میں انقلاب ، سیاسیات ، مذہبیات میں انقلاب ، یکسر انقلاب ، تمام تر انقلاب " . . . . .

وسیع سامراج دشمن محاذ زمین پر بنتے دیکھ کر " وفاداران ازلی کا پیام ہندوستاں کے نام " میں سامراج کو یوں للکارا۔

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا لہو
آندھیاں آنکو ہیں اے بادشاہی کے چراغ
تندرو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی امنگوں کو دبا سکتے نہیں
چونکیے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

"انسانیت کا کورس" اور "نظام نو" آزادی و انقلاب کی ایسی سیاسی و تاریخی داستانیں ہیں۔ جس کا ہر حرف رجز پڑھ رہا ہے۔ جراٗت عمل کی دعوت دے رہا ہے۔ منزلِ مقصود کا پتہ دے رہا ہے۔

قریب ختم رات ہے رواں دواں سیاہیاں
سفینہ ہائے رنگ و بو کے کھل رہے ہیں بادباں
فلک دھلا دھلا سا ہے زمین ہے دھواں دھواں
افق کی نرم سانولی سیاہیوں کے درمیاں
مچل رہی ہیں زرنگار سرخیاں بڑھے چلو
رواں دواں بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو

تمہارے زیر اقتدار کارِ مہر و ماہ ہے
تمہاری ذات اصل میں الوہیت پناہ ہے
تمہارا دل رسول ہے تمہارا ذہن اللہ ہے
بس اک نفس کی دیر ہے بس اک قدم کی راہ ہے
ستارہ بار و مہ چکاں و ذرہ فشاں بڑھے چلو
رواں دواں . . . .

"نظام نو" میں سنہری فکر تیرگی پہ یوں یلغار کرتی ہے ۔

کھیل ہاں اے نوع انساں ان سیاہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پابہ جولاں ہے تو کیا
مسکرانے کیلئے بے چین ہے صبحِ وطن
اور چندے ظلمتِ شامِ غریباں ہے تو کیا

چل چکی ہے پیشوائی کو نسیم باغ مصر
آج یوسف مبتلائے چاہ کنعاں ہے تو کیا
اب کھلا ہی چاہتا ہے پرچم بادِ مراد
آج ہستی کا سفینہ وقفِ طوفاں ہے تو کیا

ختم ہو جائیگا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطحِ بزمِ امکاں ہے تو کیا
مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب
ابرِ غم ، زلفِ جہاں پر بال جنباں ہے تو کیا
سایہ افگن ہے ہیولا برقِ الوانِ سوز کا
آج صرف باغِ سلطاں خونِ دہقاں ہے تو کیا

غرض یہ کہ حضرتِ جوش کی شعلگیٔ فکر آنیچ کو دور سے محسوس کر رہی تھی ۔

نظریات پر وہ محققانہ ذہن پہلے ہی غور و فکر کر چکا تھا ۔ حالات کی زد پر آکر جدلیاتی نقطہ ، نگاہ اور واضح ہو گیا تھا ۔ تخریب میں تعمیر کا پہلو نظر آیا ۔

زندگی کی مادی حقیقتیں ، اسباب و علل کے رشتوں کی جستجو اور خارجی حالات ان میں مرکب جذبہ پیدا کر رہے تھے ۔ تبدیلی کی خواہش میں تو سب شریک تھے ۔ لیکن ایسا کیوں ہے ؟ اور کیا ہونا چاہیئے ؟ اس کا تجزیہ ہر ایک کے لبس کی بات نہیں تھی ۔ جوش قوت معنی کے دیوتا تھے

عقلی و سائنسی نقطہ نگاہ ان کا امتیازی نشان تھا۔ ہندوستان کی مسندوں پر کون سی طاقتیں مارِ خزانہ بنی بیٹھی ہیں۔ جو اپنے مفادات کو بچانے کی خاطر ملک و ملت کی فکر کو گمراہی کے راستے پر ڈال رہی ہیں۔ جوش اس سے آشنا تھے۔ زرگری کی قوتوں پر ٹوٹ کر برس رہے تھے ــــ شعور ارتقا پذیر رہے۔ وہ "قضا و قدر" کی منزلیں طے کر کے جوش کو جمہوری نظریات سے اب بہت قریب لا چکا تھا۔ طبقاتی شعور جاگ اٹھا تھا۔ اسباب و علل کے رشتے واضح تھے۔ وہ سیاست کے ہر موڑ کا تجزیہ عقل کی کسوٹی پر کر رہے تھے اپنے عہد کے سیاسی سماجی اور تاریخی ابال کو جوش ڈیم بنانا چاہتے تھے تاکہ سمت کا تعین ہو جائے۔ چمن ہند آزادی کی حقیقی سانس لے سکے، انہوں نے "پیغمبر الوہیت" نہیں بلکہ "پیغمبر زمیں" کو یوں نذرانۂ محبت پیش کیا۔

حضرت جوش ملیح آبادی۔ دائیں جانب۔ محترم بلقیس بانو (مسز مرزا عابد عباس) بائیں جانب بیرسٹر ثریا نقوی۔ پروفیسر نشاط کاظمی

السلام اے مارکس اے دانائے راز
اے مریض انسانیت کے چارہ ساز
نخل خوش حالی کی بیخ و بن ہے تو
عقدہ ہائے زیست کا ناخن ہے تو
مانتیں قومیں اگر تیرا نظام
آج تلواریں نہ ہوتیں بے نیام
دشمن پیمانۂ پست و بلند
حامیٔ بے چارگان درد مند
ھنگر دا رائی عرش بریں
اولیں ،، پیغمبر فرش زمیں ،،
ہند را آتش بہ جامے دادہ
پائے شل را ہم خرامے دادہ
روس تو رقصندۂ رخشندہ باد
زندہ باد پائندہ تابندہ باد

،، کارل مارکس ،،

،، عرش و فرش ،،

جیسا کہ کہا جا چکا ہے ، انقلاب روس کے آفتاب نے تاریکی کو کاٹا ۔ ہندوستان کی زمین پر بھی کرنوں کا جال بچھا ۔ زمین کو حرارت ملی ۔ تخم سے انکھوے پھوٹے ۔ جوش اس انقلاب سے صرف متاثر نہیں بلکہ اسے قوم کی زندگی میں ڈھالنے کے لیے بے چین تھے ۔

ہندوستانی بورژوا انفرادیت سماجی انقلاب سے خائف تھی ۔ وہ جاگیرداری عناصر کے خلاف جو آزادی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے ۔ ان کے خلاف صف بندی کے لئے تیار

نہیں تھی۔ جو کسی بھی صورت ہندوستان میں زرعی مسائل کو حل ہونے نہیں دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ برطانوی سامراج کے خلاف "اہنا دادی" کا طریقہ چھوڑ کر انقلابی راستہ اپنانے کو تیار نہیں تھے۔ کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں محنت کش طبقہ انقلاب کی باگ ڈور نہ سنبھال لے۔ انگریزوں نے صورت حال سے فائدہ اٹھا کر آزادی کی تحریک میں زنجیر ڈالنے کے لئے "گول میز کانفرنس" کا ڈرامہ رچا۔ بورژوا رہنماؤں نے آنکھ مچولی کھیلی۔ کبھی "ہاں" اور کبھی "نا" میں جواب دیا۔ مختلف شرائط کے ساتھ شرکت ضرور کی۔

جوش عملی سیاست میں نہیں تھے۔ لیکن مشاہدہ کی قوت، عقل کی پختگی اور سماجی حقیقت پسندی کی بنا پر ان کا ذہن فکری سطح پر سیاست کے ہر موڑ ہر رخ اور ہر رنگ سے جڑا تجزیہ کر رہا تھا۔ انگریز عوام کی قوتِ احساس کو سلب کرنے اور جرأت اظہار کو چھیننے کے لئے مختلف حربے استعمال کر رہا تھا۔ بورژوا سیاست دانوں کی مصلحت کوشیاں اس کے پیش نظر تھیں۔ چنانچہ آزادی کے ساتھ پھر سودے کا کاروبار شروع ہوا۔ "کرپس مشن" آیا۔ جسے کانگریس نے تین وجوہ سے رد کر دیا۔ (۱) برطانیہ کے خلاف عوام میں بد اعتمادی (۲) برطانیہ جرمنی کے ہاتھوں اس مقام پر پہنچنے کو ہے جہاں غروب نا ہونے والا آفتاب غروب ہو جائے گا۔ (۳) اس مشن کی تجاویز قبول کرنے سے خدشہ ہے کہ ہند کی تقسیم کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ چنانچہ ۱۱ اپریل کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے باضابطہ طریقے سے کرپس مشن کے خلاف ریزولیوشن پاس کیا۔"

Louis Fischer
The Life of Mahatma Gandhi
Bombay 1959 PP 12.

لیکن مسلم لیگ نے کرپس مشن کی تجاویز کو قبول کیا۔ یہاں تک کہ

The Muslim League demanded

a definite pronouncement in favour of partition
Coupland pp 279 - 80

ایشیا اور افریقہ کی طرح ہندوستان میں بھی ترقی و رجعت کے درمیان گھمسان
کا رن پڑ چکا تھا۔ طبقاتی تضادات گہرے ہو رہے تھے۔ مزدور طبقہ پہلے ہی سیاست میں داخل
ہو چکا تھا۔ برطانوی سیاست کے خلاف اس نے انقلابی جدوجہد کو تیز کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ
۱۹۴۲ء میں Quit-India movement "ہندوستان چھوڑ دو" کی
تحریک شروع ہوئی۔ جس کا کردار گاندھی جی کے non-violence رکھا گیا لیکن گاندھی
جی کی پالیسی کامیاب نہ ہو سکی۔ ہندوستانی ملاحوں نے اپنے جہازوں پر توپیں نصب کر دیں۔
بندوقوں نے دشمن کو نشانہ بنایا، "یوم رشید" کے موقعے پر ہندو مسلمان اتحاد کا روح پرور سماں
دیکھنے میں آیا۔ بمبئی میں مدن پورہ۔ بھنڈی بازار، اور لال باغ میں بریگیڈ کھڑے کر دیئے
گئے۔ یوں، مشترکہ دشمن کے خلاف ہندو مسلمان عوام کی پگ ڈنڈیاں آپس میں
گلے مل رہی تھیں۔ جو برطانوی اقتدار کے سینے میں آخری کیل گاڑنے کے لئے مضطرب و بے چین
تھے۔ آزادی کی گھڑی کی حسرت میں رات کے کاندھے پر سر رکھ کر ہزاروں سورج سو گئے تھے۔
بھیانک آندھیاں چل رہی تھیں۔ روئے ہند کی تابندگی کجلا رہی تھی بورژوا رہنما بپھری ہوئی عوامی
فوج سے لرزہ براندام تھے "چوری چورا" کا واقعہ ہو چکا تھا۔ عوامی اتحاد کے راستے میں رکاوٹیں
کھڑی کی جا رہی تھیں۔ "سمجھوتے کی سیاست" میں پناہ ڈھونڈھی جا رہی تھی۔

متحدہ، قومیت جسے انگریز اپنی چالوں سے پہلے ہی کاٹ چکا تھا۔ بورژوا
رہنماؤں نے اس خلیج کو پُر کرنے کے بجائے منافقانہ سیاست کے نتیجے میں تقسیم کے عمل کو
دوام بخشنے کی ٹھان لی۔ اس وقت کے بورژوا سیاست داں اقلیت اور قومیت کے
مسئلے کو حل نہیں کر سکے۔ چھوٹے بڑے سرمایہ دار "دو قطعہ زمین" کے لیے آپس میں لڑتے اور
عوام کے حقوق کا سودا کرتے رہے۔ قومیتوں کے سوال کو منطقی اور اصولی طور پر حل کرنے کے

بجائے مصلحت کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوئے ۔ انگلستان میں لیبر حکومت برسر اقتدار آچکی تھی ۔ بین الاقوامی سطح پر آزادی کی تحریکیں اس بات کا مطالبہ کر رہی تھیں کہ غلام ملکوں کو مکمل طور پر آزاد کیا جائے ۔ "اصلاحات" کی بات پرانی ہو چکی ہے ۔ برطانوی سامراج عالم گیر قوتوں کے دباؤ میں آچکا تھا ۔ لیکن بالائی طاقتوں کی سیاست نے اسے پھر زندگی بخش دی تھی ۔

انگریز متحدہ قومیت کے لباس کو پارہ پارہ کر کے حکومت کرنے کا عادی تھا کانگریس مسلم لیگ کے مناقشے سے اس نے ایک مرتبہ پھر فائدہ اٹھایا ۔ گفت و شنید کے باب کھلے ۔ "دانہ" ڈالا جانے لگا ۔ لیڈر دا سیاست داں جال میں آگئے ۔ جوش کی انقلابی بصیرت کے پلکوں پر عوامی مہر و خورشید کی تابانیاں جھلملا رہی تھیں ۔ قتل و غارت کی دھوپ در و دیوار پر اترتے دیکھ رہے تھے ۔ وہ ملاحوں کو لیں موسم کے اشارے سمجھا رہے تھے ۔ یگانگت کا احساس دلا رہے تھے ۔

اٹھ اے ندیم کہ رنگِ جہاں بدل ڈالیں
زمیں کو تازہ کریں آسماں بدل ڈالیں
نظامِ وحدتِ اقوام کا ہے یہ منشور
کہ یہ تصورِ سود و زیاں بدل ڈالیں

"اٹھ اے ندیم"

دوسری جانب حقیقی عوامی سیاست کے لیے میزانِ عمل یہ قرار دے رہے تھے ۔

اذنِ تبلیغ محبت دے نگاہِ ناز کو
گامزن ہیں جادۂ نفرت پہ شیخ و برہمن
دستخط کر دے جدید آئین کے فرمان پر
یہ ہے قرطاس و قلم اے ناصحِ شرعِ کہن

ٹوٹ جائے سبحۂ زنّار کا بند گراں
کھول دے ہاں دوش پر زلفِ شکن اندر شکن

ایک وسیع سامراج دشمن محاذ کمیونسٹ پارٹی کی قیادت اور صنعتی مزدور کی آمد سے آمد سے بننا شروع ہو چکا تھا۔ بمبئی اور کلکتے میں ٹریڈ یونین اپنے حقوق کی لے تیز کر چکی تھی۔ بغیر معاوضہ زمین لینے کی مہم تیز تھی violent mass revolution کا پروگرام دیا جا چکا تھا۔ لیکن سامراج نواز قوتیں آزادی کے پاٹ کو چوڑا ہوتے دیکھ کر، اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش میں دل جوڑ کر نہیں بلکہ سر جوڑ کر چل رہی تھیں۔ مشترکہ دشمن کے خلاف مورچہ بندی کرنے کے بجائے آپس میں دو قطعۂ زمین، کی جنگ جاری تھی۔

جوش کی انقلابی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دریچۂ سحر مصلحت کی چٹکیوں کے بیچ میں اسیر ہے۔ تیرگی کٹنے سے پہلے ہی نمودِ زندگی کو کچلایا جا رہا تھا۔ امانت زمیں کو تلاطم ظلمت سے نکالنے کے لئے ابھی اتحاد کی ضرورت ہے نا کہ 'لقیاؤ' کی۔ فنکار کی سامراج دشمنی اپنے عروج پر تھی۔ لیکن بورژوا رہنما مصلحت کی چوکھٹ پر سجدہ ریز تھے جوش کا قلم یوں محبت کے تخم انڈیل رہا تھا۔

اے دوستانِ برہم و یارانِ مردہ ہوش
اے شعلگی بہ سینہ و آشفتگی بہ دوش
تا کے یہ غل یہ گونج یہ ہنگامہ یہ خروش
کچھ کہہ رہی ہے مادرِ ہندوستاں خموش
اور تم کہ بھائیوں سے ہو مصروفِ گیر و دار
کیا زک خزاں کو دو گے کہ ہو دشمنِ بہار
کیا کھا کے بن سکے گا بھلا وہ رفیقِ کار
جس کی خوشی کا گُل کے مسلنے پہ ہو مدار

داری یہ غصہ تھوک دو۔ یہ تاؤ چھوڑ دو
آپس کا بن پڑے تو یہ لیتا دُ چھوڑ دو

"وقت کی آواز"

بورژوا سیاست داں برطانوی سامراج کے دیئے ہوئے جھنجھنوں سے دل بہلا رہے تھے۔ اتحاد کا لفظ اپنی معنویت کھو چکا تھا۔ انقلابی قوتیں پوری طرح طاقت حاصل نہیں کر سکی تھیں۔ انگریز نئے منصوبے لے کر آچکا تھا۔ بورژوا سیاست داں اس کا استقبال کر رہے تھے۔ لیکن جوش کا قلم سچائی، مضبوطی تابندگی اور پاکیزگی کا علم بنا ہوا برطانوی سامراج کے چہرے سے نقاب الٹ رہا تھا۔ سائمن کمیشن کی آمد پر جوش نے یوں سیاست دانوں کو آئینہ دکھایا۔

عدد تیری گرفتاری کی خاطر
مہیا کر رہا ہے آب و دانہ
لگی ہے گھات میں تیری
فرنگی کی نگاہِ جادو دانہ
اگر جینا ہے تجھ کو
سنا دشمن کو بڑھ کر یہ ترانہ
"برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ"

حافظ شیرازی

وہ سیاست دانوں کی ذہنی مفلسی کو یوں تازیانے لگا رہے تھے۔

چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہلِ مشن
شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں

وہ والیانِ ریاست جو ننگِ عالم ہیں
نظر بچا کے گلے سے لگائے جاتے ہیں
بہت بڑے "خدا" کے وکیل گاندھی جی
مگر فریب میں شیطاں کے آئے جاتے ہیں
بجا رہے ہیں بلندی پہ سازِ آزادی
"وٹو" کی ہانک بھی لیکن لگائے جاتے ہیں
خدا کی شان جو باغی عدوئے سلطاں تھے
وزیر نائب سلطاں بنائے جاتے ہیں
اگرچہ پہلو نرم ہے مگر بقولِ جگر
"ہم ان میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں"

"تمثیلی فریب"

جس وقت "وفاق" کا ڈرامہ رچا گیا تو سیاست دانوں کو یوں چیتاونی دی۔

اس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نویدِ گل
اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے
یہ بوستاں، یہ اہلِ سیاست کی شاخِ گل
شیطاں کے پاس باغ کی سوکھی ببول ہے
یہ ہے نیا نکاح کہ دولہا تو ہے خموش
قاضی یہ کہہ رہا ہے کہ جی سے قبول ہے
ہشیار اہلِ ہند کہ پھر اس زمین پر
گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے

کہتے ہیں جسکو دولتِ بے دار اہل غرب
وہ اک متاع کاسۂ جنسِ فضول ہے
ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا "وفاق"
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

جنگ سامراجی نظام حیات کی تقدیر ہے۔ جو الٹ پھیر کرلے اسی مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ سامراج اپنے معاشی تضادات کے بھنور سے نکلنے اور نئی منڈیوں پر قبضہ جمانے کی خاطر انسان کو دھان اور تیل کی طرح بکاؤ مال سمجھ کر جنگ کے ایندھن میں جھونک دیتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے دنیا کو بے آب و گیاہ کا چٹیل میدان بنا دیا تھا۔ معاشی تضادات گہرے ہو چکے تھے رجعت و ترقی کی پیکار جاری تھی۔ سیاہ رات کے بطن سے لہو میں نکلا تھا۔ سائنسی نظریات زندگی کے تقاضوں سے ابھر رہے تھے۔ زمین کی گرمی سے اس میں اکھوے پھوٹ رہے تھے۔ محنت کش طبقہ جامع فکر لئے۔ تاریخی شعور سے مزین، طبقاتی کشمکش سے آشنا۔ انقلابی نظریات سے ہم آہنگ میدان کارزار میں اتر چکا تھا۔ قوموں کے حق خود ارادیت کا نظریہ جڑ پکڑ چکا تھا۔ جسے تاریخ میں پہلی مرتبہ مفکر اعظم لینن نے دیا تھا۔ کارل مارکس کے زمانے میں سرمایہ داری اس مقام پر نہیں پہنچی تھی جہاں لینن کے وقت میں تھی۔ لینن نے ایک طرف سامراج کو جو سرمایہ داری کی آخری شکل تھی اس کے خدوخال سے زمانے کو آگاہ کیا تھا دوسری طرف اس نے سامراج کے خلاف بنیادی مخالف قوت جو حق خود ارادیت کی تھی اس کا تجزیہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ دو طرح کی جنگ ایک داخلی استبداد کے خلاف اور دوسری بیرونی سامراج کے خلاف سوشلسٹوں کی شریعت میں حلال ہے لیکن منڈیوں کی خاطر جنگ کرنا ترقی پسندوں اور سوشلسٹوں کی شریعت میں حرام ہے۔ چنانچہ یہ وہ آتش صفت نظریہ تھا۔ جو جنگل کی آگ بنا۔ سامراج کے خلاف جہاد میں تیزی آئی۔ تاج اچھالے گئے۔ تخت گرائے گئے۔ ذہنوں نے جاگیر کا جھلملاتا لباس اتارا۔ محنت کے پرچم لہرائے۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ

بین الاقوامی آزادی کی تحریکوں سے جڑا ہوا تھا ۔ آزادی و انقلاب کی آندھیوں نے برطانوی
تاج کو پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا ۔ سامراج نے گھبرا کر قلعہ کی دیواریں بلند کر دیں ۔
جرأت اظہار پابہ زنجیر اور ہوا ۔ سروں میں گرم سلاخیں ٹھونک دی گئیں ۔ گھمسان کا رن پڑا ۔
تحریک آزادی نے مختلف کروٹیں بدلیں ۔ عوامی پارٹی پابہ زنجیر ہوئی ۔ مزدوروں کی گردن میں آہنی
طوق ڈالا گیا ۔ سبھاش چندر بوس بستر مرگ سے دو مرتبہ کانگریس کا الیکشن جیت چکے تھے لیکن
حکومت کی نگاہ میں مجرم تھے ۔ طوق و سلاسل میں مسلسل تھے ۔ گاندھی کا اہنسا وادی فلسفہ انکے
armed struggle کے تصور سے ٹکرا رہا تھا ۔ سبھاش نے بھوک ہڑتال کر
دی تھی ۔ پریسیڈنسی جیل کلکتہ سے گورنر بنگال کے نام یہ تاریخی جملے لکھے جا چکے تھے ۔

The individual must die so the nation must live. Today I must die so that India may win freedom and glory.

John Thivy. A Short Sketch of the Independence movement — Hanoi 1945

۱۹۴۱ء میں روس پر جرمنی نے حملہ کر کے بین الاقوامی پانسہ پلٹ دیا ۔ اس کے اثرات
ہندوستان کی تحریک آزادی پر بھی مرتب ہوئے peoples war کا نعرہ فضا میں
گونجا ۔ ترقی پسند تحریک کے رخسار پر سرخی نے نرت کیا ۔ مزدور طبقہ میدان میں اتر چکا تھا ۔ کمیونسٹ
پارٹی جو ایک عرصے سے موردِ عتاب تھی ۔ اس پر سے پابندی اٹھائی گئی ۔ تحریک زور شور سے آگے
بڑھی ۔ لیکن اس کے پاٹ میں پھر رخنے پڑنے شروع ہو گئے ۔ انگریز تجاویز کے جھنجھنے لئے پھر
میدان میں آ گئے تھے ۔ ، عارضی حکومت ، اور کیبنٹ مشن پلان منظوری کے لئے سیاستدانوں
کے سامنے رکھا جا چکا تھا جسے بہت حد تک ، منظوری ، دی جا چکی تھی ۔

، عارضی حکومت ، تشکیل پا رہی تھی ۔ عوام کی آنکھوں میں لہو ابل رہا تھا ۔ کھیت ، سبزہ تو رستہ ، وسعت چمن سب جل رہے تھے ۔ تحریک کی تابندگی ڈوب رہی تھی ۔ تہذیب کا رنگ کجلا گیا تھا ۔ جوش کی انقلابی نگاہ اسباب و علل پر نگاہ کجائے حالات و واقعات کی کڑیاں جوڑ کر نتائج اخذ کر رہی تھی ۔ " عارضی " حکومت ،، کے حلف وفاداری پر دو نعرے ،، جیسی معرکتہ الآرا نظم تھی ۔

جیل کے اندر (۱)

ہاں میں باغی ہوں وہ باغی برق دوز و شعلہ باف
سانس جس کی ڈالتی ہے طاقِ کسریٰ میں شگاف
ہاں وہ باغی ہوں کہ سن کر جس کا حرفِ انقلاب
چند نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

" رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑ کائے ہے
مژدہ تاج و تخت پھر ٹھوکر میری کجلائے ہے

جیل کے باہر (۲)

ہاں قسم کھاتا ہوں میں اس فاقہ کش بنگال کی
روح جس کی سو رہی ہے چادر اوڑھے کال کی
آج بھی ہیں سرخیاں جس میں دلوں کے داغ کی
ہاں قسم کھاتا ہوں اس جلیان والا باغ کی
عزم راجی کی قسم اور روحِ جھانسی کی قسم
ہاں بھگت سنگھ اور اس 'باغی' کی پھانسی کی قسم
جارج کی اولاد در اولاد در اولاد در اولاد
باپ کا چاکر رہوں گا اور بیٹے کا غلام
'مل' کے آقاؤں کا بھی یا در رہوں گا حشر تک
چٹکیاں لیتا ہے میرے خون میں جن کا نمک

جوش کی یہ نظم ہمہ گیر صداقت کی حامل ہے ۔ جہاں جہاں ظلم و جبر کے خلاف حیات نو کے نقیب انسان نیز کی ماتی زمینوں کو جگار رہا ہے اور فکر نو کے موتی رول رہا ہے۔

آزادی کا کارواں سیاسی رہنماؤں کی قیادت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ متحدہ ہندوستان کانگریس کا ideal تھا۔ لیکن منافقت کے ہاتھوں وہ آئینہ چکنا چور تھا۔ لورڈ و رہنما قومی مسئلہ وسیع بنیادوں پر حل کرنے سے قاصر تھے۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے لکھا تھا۔

If the vast majority of Muslims regard themselves as a separate nation having nothing in common with the Hindus and others no power on earth can compel them to think otherwise. So far as I can see, such a partition is silently going on on behalf of both the parties. That way lies suicide.

"Harijan" 18th April 1942.

فرقہ وارانہ یانی قوم کی نس نس میں اتارا جا چکا تھا ۔ "سینوں سے خون چرانے والے" فاتح تھے۔ خورشید نو نکلنے کی جگہ ہر بام و در سے "مسلمان پانی" "ہندو پانی" مانگا جا رہا تھا۔ جوش عہد گل کی تمنا میں عوام کے ساتھ متحدہ قوت کا بند باندھے کھڑے تھے۔ لیکن اب نفاق کا پانی سر سے اوپر جا چکا تھا۔ بین الاقوامی حالات کی تبدیلی سے نا غروب ہونے والا آفتاب زد پر تھا۔ جہازی عوامی جھنڈے شاہی جہازوں پر لہرا چکے تھے۔ آزاد ہند فوج کی

آمد سے فضا نے لرزہ براندام تھی۔ متحدہ قومیت کے سینے میں اب تقسیم کا خنجر پیوست کرنا عالم گیر سیاست کے لئے ضروری قرار پا چکا تھا۔ تاکہ چھوٹی منڈلیوں کو اپنے زیر اثر لایا جا سکے۔ فلسطین کے سینے پر اسرائیل کا کھوڑا ٹپک رہا تھا۔ تقسیم کے عمل سے قبل ماؤنٹ بیٹن نے سیاسی رہنماؤں کو یہ یقین دلایا تھا کہ تقسیم سے فرقہ واریت کا زہر نہیں پھیلے گا۔

I also asked Mount-battam to take into account the likely consequences of the partition --- if the country is devided there would be river of blood ---- British would be responsible for the carnage --- He replied I shall see that there is no bloodshed.

A. Azad. "India wins Freedom.

ان باتوں کے باوجود ماؤنٹ بیٹن پلان پر کانگریس اور مسلم لیگ سر تسلیم خم کر چکی تھیں بہر حال ہندوستان آزاد ہوا۔ ترانا بجایا گیا۔ پرچم لہرائے گئے۔ خشک ہونٹ مسکرا اٹھے

وطن کے روئے پاک پر ہے آب و رنگ سروری
قلندروں کے جام میں ہے بادۂ تو نگری
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے اٹھو کہ نو بہار ہے

لیکن "ہاتھ لگتے ہی رنگ گل تر چھوٹ گیا"۔ آزادی اپنے جلو میں کٹے ہوئے شانے اور شکستہ جسم لائی۔ بہنوں کا غرور چکنا چور ہوا۔ بچوں کے کھلونے ٹوٹ گئے۔ ماں

کے آنگن کی چاندنی خاموش ہوگئی ــــ کانگریس و مسلم لیگ کے لوِر تر دا سیاسی رہنما جن میں ایک کی لپشت پناہی برلا کر رہے تھے۔ جنہوں نے چین کی افیون کی جنگ میں سرمایہ بٹور لیا تھا۔ اور دوسرے کی اصفہانی کر رہے تھے۔ جو قحط کے دوران بنگال کے چاول کا ذخیرہ کر کے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ انہیں دونوں سرمایہ داروں نے مشترکہ بنیک کی بنیاد بھی اسی زمانے میں ڈالی تھی۔ ایسی صورت میں سیاسی رہنما قومی اور قومیت کے مسائل صحیح پس منظر میں حل نہیں کر سکے۔ متحدہ قومیت کی آفتابی روایت کی پاسبانی نہیں کر سکے ــ فرقہ پرستی کا زہر زمین میں پیوست کیا جا چکا تھا۔ راجے، رجواڑے، اور جاگیر داروں کی فوجیں لاشوں پر گھوڑے دوڑا رہی تھیں۔ سامراج کا چہرہ بشاش تھا۔ حیاتِ انسانی افسردہ شاخ تھی۔

جوش کا حقیقت نگرادراک آزادی کے چہرے پر نگاہ جمائے تھا۔ اندھیرا اور اجالا سامنے تھا۔ بالائی سطح پر داخلی و خارجی قوتوں کے ہاتھ دستانوں سے باہر آ چکے تھے۔ دو مملکتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ "جشنِ آزادی" منایا جا رہا تھا۔

قتال خون و جنگ ہے جنونِ جبر و قہر ہے
گرج ہے بات بات میں فسادِ شہر شہر ہے
فضا پہ رقصِ مرگ ہے زمیں پہ موجِ زہر ہے
سیاہیوں کا زور ہے تباہیوں کی لہر ہے
کماں میں تیرِ حرب ہے کمیں میں شہر یار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ حکومت کی باگ ڈور ہندوستانیوں نے سنبھال لی تھی۔ ترانے نے رنگ بدل ڈالا تھا۔ آزاد ہندوستان کا خاکہ تیار تھا۔ اب اس میں رنگ بھرنا باقی تھا۔

جوشؔ کے خلاق ذہن نے مستقبلِ ہندوستان کے خاکے میں یوں رنگ جھلکتے دیکھا۔

اٹھو دریچہ کھل گیا وہ منزلِ فراز کیا
وہ غزنوی کے قصر میں دیا جلا ایاز کا
اٹھو کہ اس زمین کو ہم آسماں بنائیں گے
عمارتوں کو پھونک کر امارتوں کو ڈھائیں گے
نشیب کو ابھار کر فراز کو جھکائیں گے
سفینۂ بحرِ نور میں غرور سے چلائیں گے
اگرچہ اپنے گرد و پیش آج موجِ ناز ہے
بہار پھر بہار ہے بہار پھر بہار ہے

پیداواری رشتوں کی تبدیلی ہی سے سیاست، تہذیب اور کلچر کی تبدیلی عمل میں آتی ہے۔ پرانا معاشی ڈھانچہ فرسودہ اور بیکار ہو چکا تھا۔ اس میں توانائی صنعتی انقلاب کے ذریعے ہی لائی جا سکتی تھی جس کا عمل بہت بعد میں شروع ہوا۔ آزادی کے بعد بھی معاشی نظام جوں کا توں رہا۔ بورژوا جمہوریت یقیناً قائم ہوئی۔ لیکن ہر امید ناتراشیدہ تھی۔ ریت کے سوکھے ٹیلے، سربرہنہ زندگی، کئی ہونٹوں سے چوسا ہوا انسان درد کے ریگزار میں جھلس رہا تھا۔ جنگِ زرگری احساس کو کچل کر اپنے ایوانوں میں چراغاں کئے تھے۔ ضمیرِ انساں اسبابِ مفلساں کی طرح بک رہا تھا۔

جاگیردار طبقے کے فرد ہونے کے ناطے جوشؔ کو اپنے طبقے کی دیرینہ روایت سے جڑا رہنا چاہیے تھا۔ 'مصلحت'، یا خاموشی، ہندوستان کا سونا بدن اجالا ذہن فکر کی جگمگاہٹ لیے، جواہر لعل سچے موتیوں کا محبت بھرا تھال جوشؔ کی نذر کر چکا تھا۔ انہیں 'پدم بھوشن' کا خطاب دیا جا چکا تھا

اب جوش تاریخ کے دوراہے پر کھڑے تھے۔ اگر عوامی مفادات کے پیش نظر جرأت اظہار سے کام لیتے ہیں۔ انکار کی منزل پر آتے ہیں۔ تو حال کی آسودگی جلتی ہے۔ "لعل و جواہر" بکھر جاتے ہیں۔ دوستی کجلا جاتی ہے۔ اور اگر قوت احساس کو سلب کراتے ہوئے "مصلحت" اور "خاموشی" اختیار کرتے ہیں تو عوام کے سامنے شرمندہ اور مستقبل کی زرنگار قوتوں کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں۔ جوش کے قدم ایک لمحے کے لئے رک گئے۔ فکر نے سوچنے سے انکار کر دیا۔ لیکن دوسرے لمحے جوش سمندر سے کرن سورج سے اور دھار عوامی تلوار سے جڑی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم کی دوستی اور اپنی آسودگی کو، عوام کی محبت پر قربان کر دیا۔ بورژوا حکومت کے کردار کو اس طرح آئینہ دکھا دیا۔

سرو سہی نہ ساز نہ سنبل نہ سبزہ زار جیحوں نہ جام جم نہ جوانی نہ جوئے بار
بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار گلشن نہ باغباں نہ گلابی نہ گل عذار تھے

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

یا اپنی دوسری نظم میں حکومت وقت کی یوں کردار کشی کی۔

چھٹکی جو چاندنی تو بڑھی ظلمتوں کی شان بازار جب کھلا تو ہوئی بند ہر دکان
چھیڑے جو راگ سر پہ کڑکنے لگی کمان چھت کی لگی جو ڈاٹ تو شق ہو گیا مکان

درماں سے اور دل ہمہ تن درد ہو گیا
پھوٹی کرن تو صبح کا منہ زرد ہو گیا

دشمن گئے تو دوست بنے دشمن وطن شبنم جو پی تو کھول گئے لالۂ و سمن
سنکی ہوائے سرد تو کجلا گیا چمن خلوت کی تہہ کھلی تو برآمد ہوا کفن

نغمے چھڑے تو شور سر بام مچ گیا
چٹکی کلی تو باغ میں کہرام مچ گیا

ہر موئے زلف اینٹھ گیا مار بن گیا ہر مہر کا خطیب جفا کار بن گیا
ہر صبح کا رسول شب تار بن گیا ہر لوح اک اپی ہوئی تلوار بن گیا

"بدلی نگاہ طور سے بے طور ہو گئے"
تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے

سکھ نے گرو کے نام کو بٹہ لگا دیا مندر کو برہمن کے چلن نے گرا دیا
مسجد کو شیخ جی کی کرامت نے ڈھا دیا مجنوں نے بڑھ کے پردۂ محمل جلا دیا

اک سوئے ظن کو غلغلۂ عام کر دیا
مریم کو خود مسیح نے بدنام کر دیا

سکوں کے انجمن میں خریدار آ گئے سیٹھوں کے خادمان وفادار آ گئے
کھدر پہن پہن کے بد اطوار آ گئے در بر سفید پوش سیہ کار آ گئے

تاریکیوں کو چھوڑ کے روشن جبیں گئے
جو لوگ آسمان تھے زیر زمیں گئے

سرو سہی، نہ ساز، نہ سنبل نہ سبزہ زار بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جام جم نہ جوانی نہ جوئے بار گلشن نہ گل بدن نہ گلابی نہ گل عذار

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

فٹ پاتھ، کارخانے، ملیں، کھیت، بھٹیاں گرتے ہوئے درخت سلگتے ہوئے مکاں
بجھتے ہوئے یقین بھڑکتے ہوئے گماں ان سب سے اٹھ رہا ہے بغاوت کا پھر دھواں

شعلوں کے پیکروں سے لپٹنے کی دیر ہے
آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کی دیر ہے
وہ تازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار
وہ سنسنائی آنچ وہ اٹھنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ وہ غلطاں ہوا غبار
اے بے خبر وہ آگ لگی آگ۔ ہوشیار
بڑھتا ہوا فضا پہ قدم مارتا ہوا
بھونچال آرہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

مصلحت ناآشنا جوشؔ کا قلم جرارت کے شرارے بھر رہا تھا فضا پر "انکار" کی بجلیاں گرا رہا تھا۔ حکومت کی قبا کو آگ دکھا رہا تھا۔ سماجی حقیقت نگاری کا روشن باب وا کر رہا تھا۔

خائن ہوئے حریم امانت میں باریاب
شیطاں بنے فراز ہدایت کے آفتاب
بیڑے ڈبو چکے ہیں جو بے حد و بے حساب
ان ظالموں کا حضرتِ الیاس ہے خطاب
وہ جو تمام راہزنوں کا امام ہے
وہ شخص آج خضر علیہ السلام ہے
گو حکم ہے کہ بند شبستاں کا در نہ ہو
جو آئے، اعتراض کسی شخص پر نہ ہو
قدغن ہے یہ مگر کہ لب خشک تر نہ ہو
اندر سبھا میں لال پری کا گذر نہ ہو
روشن تھے کل جو سرخ پیالوں کے سامنے
گل آج وہ چراغ ہیں کالوں کے سامنے

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ حکومت پر بے باکانہ تنقید کے باوجود جوشؔ پر سنگ باری نہیں ہو رہی تھی۔ "جوش مسلمان ہے"، اسے دیس نکالا دیا جائے۔ یہ آواز کسی بھی گوشے سے نہیں اٹھ رہی تھی۔ جواہر لعل کا بلوریں ذوق سماعت تنقید کو لبیک کہہ رہا تھا۔ عوام کی نگاہ میں جوشؔ افق ہند کے ماتھے کا تاج تھے۔ تاج کے

گرنے سے اس کے حسن میں فرق آجائے گا۔ پتی پتی لوٹا لوٹا، یہ محسوس کر رہا تھا۔
جوش کی فکر پختہ تھی۔ اسباب و علل کی کڑیوں پر نگاہ تھی۔ رشوت سرمایہ داری نظام
کی دین ہے۔ یہ ملک و قوم کے سینے میں سرطان ہے جو مرغزاروں کے حسن کو کھا جاتا ہے
ضرورت اس امر کی ہے کہ بنیادی بھتوں کو نئے سرے سے ترتیب دیا جائے تاکہ معاشی انصاف
قائم ہو سکے۔ جوش ببانگ دہل کہہ رہے تھے۔

ٹھیک تو کرتے نہیں بنیادِ ناہموار کو ۔۔۔ دے رہے ہیں گالیاں گرتی ہوئی دیوار کو
سچ بتاؤں زیب یہ دیتا نہیں سرکار کو ۔۔۔ پالئے بیماریوں کو مار دیئے بیمار کو

علت رشوت کو اس دنیا سے رخصت کیجئے
ورنہ رشوت کی دھڑلے سے اجازت دیجئے

یا

بدصورت بدشکل ہیں لیکن بدی ہے نازنیں ۔۔۔ جبڑ کو لبے دے رہے ہیں پڑے جین برجبیں
آپ گویائی اچھے ہیں یہ طرز دل نشیں ۔۔۔ ناؤ کا سوراخ لیکن بند فرماتے نہیں

کوڑھیوں پر آستیں کب سے چڑھائے ہیں حضور
کوڑھ کو لیکن کلیجے سے لگائے ہیں حضور

اردو زبان جوش کی محبوبہ تھی۔ جس کے عشق میں نخرے اٹھانا ان کی عبادت تھی۔
اس پر حرف آتے دیکھ کر وہ اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ قومی حکومت کی
تشکیل کے بعد جب ان کی محبوب زبان کے وقار پر ضرب پڑی تو وہ اس طرح بیاکل ہو گئے اور
قلم کی تیغ نیام سے نکل کر لوں حکومت پر برسنے لگی۔

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی ۔۔۔ چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمٰن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی ۔۔۔ گدی سے کھینچ گئی جو زباں تھی عوام کی

حیوان بوکھلا گئے، منہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے۔

زبان کسی بھی قوم کا خوبصورت خزینہ، دولت اور امانت ہوتی ہے۔ جس کی دیکھ ریکھ کرنا اور خوب سے خوب تر کی منزل کی طرف لے جانا مہذب حکومت کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ یہی وہ پہلو تھا جس کی جانب جوش اپنے زرنگار قلم سے ضیا بکھیر کر ذہنوں کی تاریکی کو دور کرنے میں کوشاں تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ جو حکومت عوامی خواہشات کو روندتی ہوئی آگے بڑھتی ہے وہ ریگستان میں ہل چلاتی ہے جس کا ایک نہ ایک دن ڈھے جانا لازمی ہے۔ جوش کی نظر میں انقلابات زمانہ کی تمام کروٹیں تھیں۔ وہ ہر شکن کے شناسا تھے۔ اس لئے وقت کے حکمرانوں کو یوں چتاونی دے رہے تھے۔

کتنے ایوانوں کو ویراں کر چکا ہے انقلاب
چند نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

حاکموں کی شمع بن جاتی ہے پل بھر میں دھواں خادموں کی مشعلوں سے کانپتی ہیں آندھیاں
حاکموں کی گور پہ چادر پہ منڈلاتے ہیں زاغ خادموں کی قبر پہ جلتے ہیں یادوں کے چراغ

چھین لیتے ہیں حوادث حاکموں کی کرسیاں
خادموں کی مسندیں رہتی ہیں مثل کہکشاں

اقتدار کی منتقلی کے بعد بورژوا حکمرانوں نے اپنے وعدوں سے پہلوتہی کی۔ عوام ناآسودہ اور نامراد رہے۔ "ماتم آزادی" اور "رشوت" جیسی نظموں میں جوشؔ کے قلم نے حقائق کو آئینہ دکھایا۔ ہندوستان کا مستقبل انقلاب کے بعد کیا ہونا چاہیے تھا۔ اس کا نقشہ ان کے ذہن میں یہ تھا۔

روکش دشت و جبل قصرِ سلاطیں ہوں گے
میز بامِ فلک مکتبۂ دہقاں ہوگا
قدمِ خضر پہ جھک جائے گی شاہی کی جبیں
دستِ افلاس میں دولت کا گریباں ہوگا
پک رہا ہے جو بیاباں کی کڑی دھوپ میں آج
کل اسی سر کے لئے تاجِ گل افشاں ہوگا
آج جس رعب سے ہے روئے امارت پہ شکوہ
کل وہ مزدور کے چہرے سے نمایاں ہوگا
"نفسِ بادِ صبا مشک فشا خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد"

مادی فلسفۂ حیات کی روشنی میں سرمایہ و جاگیر کی قوتوں کی بیخ کنی اور محنت کشوں کے مستقبل کی بشارت فعالِ نیک ہے۔ لیکن طبقاتی معاشرے میں بورژوا حکومت اسٹیٹ مشنیری کو عوامی حقوق کو کچلنے کے لئے کس عنوان استعمال کرتی ہے۔ سرمایہ و جاگیر کے طبقاتی تضادات گہرے ہو کر کیسے اسے کھوکھلا کرتے ہیں؟ تضادات کے گہرے ہونے سے محنت کش طبقہ کس طور سماج کی بنیادی تہوں میں انقلاب پیدا کر کے اپنے حقوق کا پرچم بلند کرتا ہے اور عوامی جمہوریت قائم کرتا ہے۔ جوشؔ کے یہاں اس قسم کے خیالات یا اشارے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انقلاب کا تصور طبقاتی تضادات، اور کشمکش سے جڑا ہوا ہے۔

علیحدگی میں اسے سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ عوامی انقلاب کا مقصد صرف ایک کڑی کو توڑنا نہیں بلکہ پورے سلسلے کو ختم کرنا ہوتا ہے اور ایک ایسے نئے سلسلے کو جنم دینا ہوتا ہے جہاں قلیل طبقے سے آزادی اور اس کی نعمتیں نکل کر پوری فضا پر چھا جاتی ہیں اور اکثریتی طبقے کا حصہ بنتی ہیں۔

سائنسی نقطۂ نگاہ سے سماج میں سب سے زیادہ اہم طبقہ مزدور اور کسان کا ہے جس کا چہرہ میلا ہے، کپڑے پھٹے ہیں، ہاتھ کھردرے ہیں لیکن شعور جوان ہے۔ اس لئے وہ طبقاتی نظام اور فرسودہ معاشرے کو ڈھا کر نئے نظام کی تخلیق کرتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کو جوش نے "ارتقا کا پیشوا" اور "تہذیب کا پروردگار" جیسے زریں القاب دیئے۔ اور "مزدور کے چہرے پر امارت کا شکوہ" دیکھنے کی تمنا کی۔ یہ تمنا انقلاب کا صحیح ادراک ہے۔ لیکن مسائل حیات کو محنت کش طبقے کی نگاہ سے دیکھنا اور طبقاتی سماج میں اس کی سمت متعین کرنا بھی ضروری ہے۔ لینن کے الفاظ میں "ہم گناہگار" انسان ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ پہلے اس گناہگار انسان کو ہم پہچانیں۔ اور پھر یہ ثابت کریں کہ یہی گناہگار انسان جس کے سر پہ سرمایہ دارانہ سماج کے گناہوں کا بوجھ لدا ہوا ہے اپنی عظیم الشان جدوجہد، اپنی انتھک محنت، بھرپور قوت ارادی، اور پختہ شعور سے طبقاتی سماج کو ڈھا کر اپنا حق و مقام کس طرح حاصل کر لیتا ہے"

گورکی کے الفاظ میں "پرولتاریہ کی دوستی بالکل سیدھی اور صاف ہوتی ہے۔ وہ شاندار الفاظ میں محبت کا اظہار نہیں کرتی ...... اس کا مقصد ساری دنیا کے پرولتاری طبقے کو سرمایہ داری کے شرمناک، خونی، اور وحشت ناک جوئے سے آزادی دلانا۔ اور انسان کو سبق پڑھانا کہ وہ اپنے آپ کو ایسی اشیاء نہ سمجھیں جنہیں خریدو فروخت کیا سکتا ہے"۔ پرولتاری انسان دوستی محنت کش طبقے سے اپنے تاریخی مشن اور اپنے حق اقتدار اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا مطالبہ کرتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ طبقاتی سماج میں حصولِ آزادی کی جنگ میں جوش بھرپور یقین اور عزم کے ساتھ سامراج اور سرمایہ داری کے جانی دشمن اور محنت کش طبقے کے دوست اور

ساتھی ہیں۔ تاریکی کو کاٹ کر اجالا پھیلانے کے لئے مضطرب اور بے چین ہیں۔ اپنی معرکتہ الآرا نظم "کسان" میں تعمیری حسن، نئی تراکیب، خوبصورت تشبیہات و استعارے نئے احساس لطافت کے ساتھ کسان کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے شعور کی تیزی اور جولانی تخلیق کی رو میں سرمائے کے جبر تلے کسان کی انفرادیت کو یوں کچلا ہوا اور اس کے احساسات میں یوں شعلے بھڑکتے ہوئے دیکھے ہیں

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منہ اترا ہوا
سیم و زر آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

یہاں کسان کے جذبات راکھ کے نیچے سلگ رہے ہیں۔ آنسو تھرتھرا رہے ہیں۔ سماجی ناانصافیاں، بے ایمانیاں، ریاکاریاں سب نگاہوں کے سامنے ہیں۔ سماج کے ڈر سے دبی آہیں ہیں۔ جس کا اظہار خطرے سے پاک نہیں لیکن جوش کا محنت کش طبقے کی طرف مشفقانہ اور ترحم کے جذبات رکھنا سائنسی نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں ہے کیونکہ سماجی ارتقا کی منزل پر یہی طبقہ تخیل میں نہیں بلکہ عمل سے سیاسی و اقتصادی زنجیروں کو کاٹتا ہے۔ جمود کو توڑتا اور اپنے سحر آفریں عمل سے ایسا طوفان اٹھاتا ہے جو امارت کے ہر نشان کو اور ناآسودگی کے ہر داغ کو سیل بے پایاں میں بہالے جاتا ہے۔ زندگی کو دوآتشہ اور سہ آتشہ بنا کر ہر محبوبہ کی آغوش مسرتوں کی کلیوں سے بھر دیتا ہے اور کسی ترحم کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ تغیر کی نوعیت اور سماج کے رفتار ارتقا سے واقف ہوتا ہے اس لئے وہ زمانے کے "دیے نور" ماتھے پر تاج رکھ دیتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جوش نے جمود پرست حکمراں طبقے اور سماجی نظام کے جبر تلے مرجھائی ہوئی کلیوں اور زرد پھولوں کی بتوں سے درد کا طوفان اٹھتے دیکھا۔ جبر کے خلاف جنگ میں انہوں نے ہندوستان کے شعوری اور غیر شعوری احتجاج کو قلمبند کیا اور انقلاب کے لئے ہر آن راہ ہموار کی۔ ہندوستان کے کرب کو گرفت میں کیا۔ جو زرگری کی قوتوں پر طمانچہ ہے۔

آہ اے بے کس ضعیفہ غم کی تڑپائی ہوئی
اے زمانے کی جھنجھوڑی ، زر کی ٹھکرائی ہوئی
یہ ترے سر کی سفیدی اور یہ گردِ ملال
میں تو کیا، شرما رہا ہے خود خدائے ذوالجلال
اف ری مایوسی کسی کا آسرا رکھتی نہیں
شبہ ہوتا ہے کہ تو شاید خدا رکھتی نہیں

جوش کا ذہن ارتقا پذیر ہے ان کی فکر واقعات کی رفتار کے ساتھ ہے اور ان کا فن سماجی حالات کا تجزیہ کرتا ہے۔ محنت کش طبقے کے مقابلے میں وہ ظالم طبقے کے جبر و استبداد کا پردہ ہر مقام پر چاک کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی جب وہ یہ کہتے ہیں کہ

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا — اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا
یہ بن یہ گل یہ چشمے مجھ سے قریب ہوتے — شاعر کے زیر فرماں یہ سب رقیب ہوتے
کیوں میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے — اے زمزموں کی دیوی اتنی خموش کیوں ہے

یا

ان نباتِ کوہ کی کڑیل جوانی الاماں — پتھروں کا دودھ پی کر ہوئی ہیں جو جواں
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنہیں — آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنہیں
کیا خبر کتنے دلوں کی جوش پامالی ہوئی — ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

ے ایک انقلابی شاعر کا محنت کشوں کی طرف محبت کا یہ رویہ بورژوا نظریات کی حدود میں مقید ہے۔ " سڑک پر پتھر کوٹتی ہوئی مزدور عورت کو idealize کرنا۔ سانپ اور بچھوؤں کے جنگل میں حسن کی شہزادی ڈھونڈ نکالنا۔ جامن والی کو idealize کرکے اسے دل میں جگہ دینا خالص بورژوا انداز ہے جنہوں نے غربت کو جوں کا توں رکھنے کے لئے یہ فلسفہ گھڑا کہ امیروں کو غریبوں کی سادہ اور بے فکر زندگی

پر رشک آتا ہے۔ اس لئے مفلسی کو مٹانے کی ضرورت نہیں۔ گورکی ،، حقیقت نگاری کا امام تھا۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ ،، ہم مفلسی ، غربت ، جہالت ، تنگ نظری اور اس قسم کی دوسری لعنتوں کو نہیں کرتے ہم ان چیزوں کے گن نہیں گاتے بلکہ ان کے خلاف مسلسل جد وجہد کرتے ہیں اور انسان کو پستی سے نکال کر ارتقا کی شاہراہ پر لگا دیتے ہیں" ....،،

جوش شاعر شباب ہیں۔ وہ بانسریوں کی تانوں میں لہرائے۔ حسن کی شاخوں میں جھولے۔ پیتیوں پر لیٹے۔ شعلوں کے اطراف طواف کیا۔ نیرنگیوں سے راز و نیاز کیا۔ ولولوں کو معنی کی کھنک بخشی۔ زندگی کی پور پور چٹخائی۔ حسن و عشق کے آبشاروں میں نہائے لیکن جس وقت ملکی و ملی مسائل نے انہیں آواز دی۔ وہ اپنے درد کے خول سے نکل کر درد کے دریا میں ڈوبے۔ بت شکن بن کر سامراجیت کے خلاف علم انقلاب لے کر نکلے ،، ترک جمود ،، اس کی گواہ ہے۔

ہوا ہے حکم کہ بن راز دانِ آتش و برق
اب آبِ چہرۂ خوبانِ لالہ فام کہاں
چلا ہوں سر بکف اس سمت آج خود ہی جوش
اب آرزو کو سرِ نامۂ پیام کہاں

دوسرے مقام پر فرمایا

جب بلاتے ہیں فرائض دردناک آواز سے
سورما منہ پھیر لیتے ہیں ترنم ناز سے
زندگی منہ دیکھنے لگتی ہے جب تلوار میں
روشنی رہتی نہیں محبوب کے رخسار میں

انقلاب لانے کے لئے محبوبہ سے بے رخی کرنا۔ اور اس کے رخساروں کی آنچ کو محسوس نہ کرنا رومانوی انداز فکر ہے۔ اس فکر کے سہارے بہت سے ترقی پسند شعراء شکار ہوئے ،، مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" یا چند ہی روز مری جان چند ہی روز ،،

سائنسی نقطۂ نگاہ سے یہ انداز اور سوچ صحیح نہیں ہے کیونکہ انقلاب اور محبت میں بعد نہیں انقلاب لایا ہی اس لیئے جاتا ہے کہ محبت جس پر "چند بزرگان دین" قابض ہیں وہ سب کی ملکیت بنے اور ہر کس و ناکس محبت و پیار کی رعنائیوں سے بہرہ ور ہو تا کہ زندگی میں طاقت و توانائی اور زیادہ پیدا ہو۔ مقصدِ حیات کو پانا اور آسان ہو جائے۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

(مجروح سلطان پوری)

انقلاب جوش صاحب کی محبوبہ ہے جس کا گھونگٹ اٹھانے کی بے پناہ تڑپ اور بے چینی میں ان پر دو کیفیات ابتدا میں گذرتی ہیں۔ اول وہ اپنے ہم وطنوں پر اس طرح برستے ہیں

ائے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ

یا

تجھ پر لعنت ائے فرنگی کے غلام بے شعور

دوسری کیفیت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے۔

ہٹ کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں

پہلی صورت جوش کے یہاں اس بنا پر ہے کہ وہ طبعاً جذباتی ہیں۔ اس لیئے ہر جذبے کا ردعمل شدید ہوتا ہے۔ انقلاب کی رفتار تیز نہ دیکھ کر اور عوام کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا اور مجبور دیکھ کر وفور جذبات محبت میں وہ عوام ہی کو اپنی برہمی کا نشانہ بناتے ہیں اور ان سیاسی و سماجی بنیادوں اور قوتوں کی شاطرانہ چالوں کو نہیں سمجھ پاتے ہیں جو پائے انقلاب کو زنجیر گراں بنائے ہوئے تھے۔ اشتراکی نقطۂ نگاہ سے محنت کش عوام کو ایک انقلابی شاعر کا "غلام بے شعور" کہنا جائز نہیں کیونکہ محنت کشوں ہی کا قندیل صفت شعور تاریکی کو کاٹتا اور "سویرے

کو قریب لاتا ہے۔"

ہٹ کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں
کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا انقلاب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب

یہاں جوش کی فکر رومانیت سے ہم کنار ہے۔ کلاسکیت اور رومانیت کی بحث بہت پرانی ہے۔ کلاسکیت کا تصور تغیر دشمن سماج نے دیا جس نے زندگی کو قدامت پرستی کی زنجیروں میں جکڑ کے اس کی خانہ بندی کردی اس لئے Herbert Read نے اسے (کلاسکیت) کو سیاسی استبداد، سے تعبیر کیا۔ صنعتی انقلاب نے اقتصادی ترتیب بدلی۔ تہذیبی سطح پر تبدیلی آئی۔ نئے اقدار کی تلاش ہوئی۔ جامد اصول رد ہوئے۔ نئے اصول دریافت ہوئے۔

"سی ایم بورا" نے اپنی کتاب "رومانی تخیل" میں رومانیت کی خصوصیت "تخیل پرستی" کو قرار دیا ہے۔ اٹھارویں صدی کا یورپ جامد اصولوں کا پجاری تھا۔ تخیل پر پہرے بیٹھے تھے۔ چنانچہ تخیل کو پر پرواز پھر دینا صنعتی انقلاب کا کارنامہ ہے کیٹس شیلے اور بائرن نے اسی تخیل پرستی کے تحت افسوں جگائے۔ معنی کے لحاظ سے رومانیت پہلو دار ہے۔ وہ کہیں بیماری، فرار، اور انفعالیت زدہ ہے اور کہیں انقلابی قدر ہے۔ جوش کی رومانیت انقلابی اقدار کا علم اٹھائے ہے۔ اس نے خانقاہوں کو بجلی دکھائی۔ سیاہ خانوں میں اجالا پھیلایا، جذبہ آزادی کو بیدار کیا۔ آزادی ان کے نزدیک ہر انسان کا فطری حق ہے۔ اس کی ترویج اور اس عقیدے کی اشاعت وہ رومانوی اور غیر رومانوی طور پر کرتے رہے۔

دوسرا پہلو ان کی رومانیت پسندی کا یہ ہے کہ وہ "دار ہی شود" کی منزل پر ہمیشہ برہنہ تلوار بنی رہی۔ کبھی اس نے ہمالہ کے سے بلند حوصلے سے برطانوی سامراج کی دھجیاں بکھیر دیں اور کبھی سرمائے کے کردار کو آئینہ دکھایا اور ثابت کیا کہ وہ کس طرح

اخلاق کی عبائیں پہنیں ۔ ملک و قوم کی نیو میں منافقت کا پانی دے کر ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا کام نکال رہے ہیں ۔

تیسرے انکی رومانیت مذہبی ایجنٹوں پر قہر بن کر ٹوٹی جو متحدہ قومیت کے راستے میں سنگِ گراں بنے کھڑے تھے ۔ ہر شاعر کا تخیل بلند ہوتا ہے ۔ وہ اپنے آئیڈل کی تلاش میں "خوب سے خوب تر" کی منزل کی طرف پرواز کرتا ہے اور ایک نئی دنیا "نیا شوالہ" تعمیر کرنے کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے ۔ جوش کا تخیل آزاد ہوتے ہوئے بھی حقائق کی سنگین چٹانوں سے اپنا رشتہ استوار کئے ہے ۔ یہ رومانیت ہندوستان کی قومی تحریک کے ابال کا حصہ تھی ۔ جس میں ایک طرف بے باک ، نڈر ، اور جواں عزم کا شعور شامل تھا ۔ دوسری جانب ہندوستان کے بہت سے انقلابی رہنماؤں کی خود اعتمادی تھی ، جو سامراج کو دہلا کر اپنا حق چھیننے کے لئے میدان میں سر بکف نکل آئے تھے لیکن سیاست میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو رعائی انداز کے ساتھ چل رہا تھا جو برطانوی سامراج کی مخالفت میں عوام کے ساتھ ضرور تھا لیکن جب عوام کا عزم اور انقلاب کے شعلے ، آسمان سے باتیں کرتے تو وہ فوراً مصلحت کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جاتا ۔

دوسری کیفیت بھی وطن سے غیر معمولی محبت اور اس کے باسیوں پر آزادی کی بارش کی تڑپ کے نتیجے میں ہے ۔ "کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں" کی کیفیت ہے ۔ جذبات کی یہ بے عنانی اپنے عہد کی مخصوص آواز کو سمیٹے ہے ۔ جو نا آسودگی کی بنا پر کبھی احتجاج "بغاوت" ، حقارت ، انقلاب کے شعلوں کو پالینے کی آرزو میں بلند ہوتی ہے ۔ جوش صاحب اکثر انقلاب لانے کی تڑپ میں میزائل شکن توپوں کے دہانوں کے سامنے بریگیڈ اور بٹالین کا انتظار کیے بغیر پرچم تھامے نظر آتے ہیں ۔

جوش کا انقلاب کی طرف یہ رویہ ایک مخلص اور بھولے سپاہی کا ہے جو مقصد کی لگن میں بس آگے بڑھا چلا جا رہا ہے اور یہ نتیجہ اس "انا" ، اور انفرادیت کا بھی ہے جو ان کے مزاج کا حصہ ہے ۔ انفرادیت پسندی پہلودار ہے ۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ "طبقہ داری

سماج انسان پر ہر طرف سے دباؤ ڈالتا ہے اور اس کی وجہ سے انفرادیت ترقی پاتی ہے۔ انفرادیت پسندی انسان کی وہ ناکام کوشش بھی ہے جو وہ تشدد کا مقابلہ کرنے کے لئے کرتا ہے"

ایسی انفرادیت جو اجتماعی مفادات سے برسرِ پیکار ہو۔ اجتماعی مفادات کو نظر انداز کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے اس کا ہر قدم اپنی انفرادیت کی نمائش پر ختم ہو اور اجتماعی زندگی کے منافی ہو۔ ایسی انفرادیت قابلِ قدر نہیں " ایسی انفرادیت پسندی کے چشمے " ذاتی ملکیت " سے پھوٹتے ہیں۔

ایک صورت انفرادیت کی یہ ہے کہ جہاں فنکار اپنی انفرادیت کے ذریعے اجتماعی مفادات کا علمبردار بن جاتا ہے۔ قوم اور ملک کا اجتماعی مقصد فنکار کا انفرادی جذبہ بن جاتا ہے۔ یہ منفرد انداز سمندر میں پیر کر حاصل ہوتا ہے۔ جب فنکار مچھلی کی طرح پانی کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہوتے ہوئے اپنے تجربات کو اجتماعیت کے مفاد میں انفرادی انداز میں بیان کرتا ہے ایسی انفرادیت قابل قدر ہے اور ادب میں حسن کی ضامن ہے۔

مادی فلسفۂ حیات کی روشنی میں کسی بھی ایک شخص کا انقلاب کا ہیرو بننا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے، انقلاب سائنسی عمل ہے اور کروڑوں سیاسی و سماجی عناصر کی طبقاتی آویزش کا نتیجہ ہے جس کی رہنمائی، فلسفۂ تغیر سے مسلح انقلابی پارٹی کرتی ہے۔ اس لئے جوش صاحب کا " انقلاب کا ہیرو " بننا جمہوری شریعت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ ان کی یہ انفرادیت جبر کے بطن سے پیدا ہوئی ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ طبقاتی جد وجہد کے تیز ہونے اور انقلابی قوتوں کے میدان میں اترنے سے ان کے ذہن کے افق پر روشنی اور تاریکی کی قوتیں خلط ملط نہیں بلکہ روشن ہو جاتی ہیں۔ ان کی انفرادیت کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ جو گرد و پیش کی فضا کو اسیر کرتا ہے انفرادیت اجتماعی تحریک کا جزو بن جاتی ہے وہ تحریک کو مہمیز دیتی ہے جو انفرادی شان سے

زمانے پر حکمرانی کا علم گاڑ دیتا ہے۔

میری شان سے بحر و بر کانپتا ہے
شجر کانپتا ہے حجر کانپتا ہے

ایسی انفرادیت اجتماعیت میں گھل جانے کے باوجود اپنا حسن اور ادا باقی رکھتی ہے۔ جوش صاحب منزل آشنا ہیں، راہوں کے پیچ و خم سے واقف ہیں۔ کل تک ان کا انقلاب کا تصور "مٹھیوں میں افشاں" بھر کر چل رہا تھا، اور کہیں وہ "ریزہ ریزہ استخواں" تھا "سیر ہو کر گوشت کھا رہا تھا"، جو کہ صالح نظریہ نہیں تھا حالانکہ اس وقت بھی انہوں نے یہ کہا تھا۔

جنگ کی صورت سے گو ہنگامہ کرتی ہوں شروع
امن کی صبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلوع

یا

کھلنے لگتا ہے مگر جس وقت پرچم جنگ کا
پہلے بڑھ کر میں حکومت کو یہ دیتا ہوں صدا
اے جفا پرور امارت۔ دیکھ ناداروں سے بھاگ
بھاگ دیوانوں کی خوں آشام تلواروں سے بھاگ
حریت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون
جذبۂ خلق خدا کو ختم کر سکتا ہے کون
رعب سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں
جو خدائی سے لڑے شاہی سے ڈر سکتا نہیں

"بغاوت"
شعلہ و شبنم

ہندوستان میں جس وقت طبقاتی کشمکش تیز ہوئی۔ ہندوستان کی آزادی

کی جدوجہد میں بین الاقوامی انقلابات کا بھی شعور شامل ہوا۔ طبقاتی جدوجہد تیز سے تیز تر ہوئی۔ اور انقلابی طبقے نے رہنمائی کے فرائض ادا کرنے کے لئے بیڑا اٹھایا۔ اس وقت، وقت کے دھارے کے دھارے کے ساتھ جوش کا شعور عوامی شعور سے جڑ گیا۔ انقلابی تنظیم اور انقلابی قوتوں کی رہبری میں جب کاروان آزادی آگے بڑھا تو فلسفہ، تغیر سے مزین انقلابی قوتوں سے اپنا رشتہ جوش نے یوں استوار کیا۔

محنت کے زرد افق سے بصد شانِ انقلاب
ابھرے گا ایک روز ترا سرخ انقلاب
گندھنے پہ ہے شعاعوں کا سہرا ترے لئے
پھر سے جوان ہوگی زلیخا ترے لئے
ہاں اپنے سر پہ لال پھریرا اڑائے تو
مالک کے برہنہ ہاتھوں میں کنگن پہنائے تو
اس کا مگر خیال رہے وقت سرخوشی
خم ہی نئی شراب ہو ساغر رہیں یہی
میری ہی کنگھیوں سے بنے زلفِ زندگی
میرے ہی جملہ ساز ہوں میری ہی راگنی

تازہ ہوں اصطلاحیں مقولے یہی رہیں
شاخیں نئی ضرور ہوں جھولے یہی رہیں

ہاں غم کشوں کے ضعف پہ جانا نہ میری جاں
یہ زردیاں ہیں تشنگیٔ خونِ مقبلاں
آہن کا کارخانہ ہیں بشکستہ ہڈیاں
غلطاں ہیں ان کے گرم پسینے میں بجلیاں

دیکھے گا سرفرازوں کی نبضیں رکی ہوئی
جس وقت سیدھی ہونگی یہ کمریں جھکی ہوئی

"وقت کی آواز"

اپنی دوسری نظم "نوخیزان جمہوری پارٹی سے" پُر خلوص انداز میں رہبری کی اس طرح توقع کی ہے۔

محو ہو جائے گا نظمِ کہنہ سرو سمن
نوخرامان چمن کو باغباں ہونے تو دو
ثابت و سیار بن جائیں گے ذرات چمن
کاہِ بے مایہ کو میر کہکشاں ہونے تو دو
مے کدے میں اک نئے انداز سے ہوگی نماز
قلقلِ مینا کو گلبانگ اذاں ہونے تو دو

"سنبل و سلاسل"

ادب سماج کی لطیف کسوٹی۔ تخلیقی عمل کی پرکھ اور زندگی کا آئینہ ہے۔ زندگی میں ترقی اور تنزلی کی طاقتیں کس طرح ابھرتی اور پھر ختم ہوتی ہیں۔ طبقے اقتدار کی منزل تک کن سیڑھیوں پر قدم رکھ کر پہنچے ہیں۔ روبہ انحطاط ہوتے ہیں۔ تضادات کے بھنور میں پھنستے ہیں۔ بغاوت۔ احتجاج، آزادی و انقلاب سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ مختلف حالات میں جو رجحانات ابھرتے اور جو فلسفے وجود میں آتے ہیں وہ کس عنوان طبقات کی فکر کو آگے بڑھاتے یا ماضی کی جانب لے جاتے ہیں۔ مثالی و مادی تصورات کس طبقے کے مفاد میں متصادم ہوتے ہیں۔ ان سب کا تجزیہ کرنا ادب کا کام ہے اس لئے کہ ادب سماجی حالات کا نتیجہ و سبب ہے۔ تاریخی ارتقا محض خارجی عوامل و اسباب کا نتیجہ نہیں بلکہ تصورات و نظریات مل کر تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں۔ اشتراکی نقطۂ نگاہ سے ادیب و شاعر کا کام یہ بھی ہے کہ وہ

یہ معلوم کرے کہ سماجی تبدیلی لانے، تخلیقی قوت بننے، اور عملی طاقت بننے سے پہلے یہ تصورات کیسے اور کیونکر پیدا ہوئے۔ اس لئے کہ تصورات سماج کی راہ میں کاوٹ بھی ہیں اور طبقات کے شعور میں روشنی بھی۔ سائنسی نقطۂ نگاہ تاریخی اور سماجی حالات اور اس عہد کے مخصوص تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ادیبوں اور شاعروں سے انقلابیت کا مطالبہ نہیں کرتا۔

اینگلز نے بالزاک جیسے قدامت پسند نظریات رکھنے والے ادیب پر جب قلم اٹھایا تو اس کی مرتے ہوئے اور دم توڑتے ہوئے طبقے سے ہمدردی رکھنے کے باوجود اسے دنیا کا عظیم المرتبت ناول نگار قرار دیا۔ اس لئے کہ ' بالزاک ' نے اپنے ناولوں میں حقیقت پسندی کے جوہر دکھائے اور انتہائی خوبصورتی کے ساتھ سماج کی ننگی تصویر زمانے کو دکھا دی۔

اسی طرح ڈرزرباؤن نے اپنے مضمون " دوزخ " میں اس بات کی نشاندہی کی کہ شیکسپیئر نے اپنے وقت میں کلچر میں کیا بیش بہا اضافہ کیا۔ جس کا اظہار اس نے ان الفاظ میں کیا۔

"ہمیں شیکسپیئر سے اس لئے محبت ہے کہ وہ ذہنی طور پر بے باک تھا۔ زندگی کا اسے بھرپور علم تھا۔ انسانیت سے اسے محبت تھی۔ وہ حقیقت پسند جنیس تھا۔ جس کے پاس بلند خیالات اور گہرے جذبات کی کمی نہیں تھی۔ جس نے سچائی کا دامن نہیں چھوڑا اور جس سے سچی زندگی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔"

لیکن جب سماج انقلاب کے دروازے کو کھٹکھٹا رہا ہو۔ جاگیر اور سرمایہ کی قوتیں اپنے آپ کو بچانے کی مہم میں انسان کو جنگ کی تباہی میں لپیٹ رہی ہوں۔ اور اپنے فاتح کو بند باندھ کر روکنا چاہتی ہوں اس وقت پختہ نظر ادیب و شاعر کا یہ فرض ہے کہ وہ ان قوتوں کے تضادات کو بالکل برہنہ کرے اس کے فاتح ہونے کا یقین وثوق سے اعلان کرے۔ انسانی فکر کو صحیح فلسفے کی روشنی میں " خوب سے خوب تر " کی طرف لے جائے۔ غیر جانبداری کی قلعئی اتار دے اور محنت کش طبقے کے تاریخی مشن کو تسلیم کرکے نئے سماج اور نئے شولے کی داغ بیل ڈالے۔

طبقاتی سماج کی ڈھتی اور گرتی ہوئی عمارت دیکھ کر اور نظریات کے برانچے

اڑتے دیکھ کر بہت سے بورژوا ادیب و شاعر احتجاج اور بغاوت کی آواز کو تو بلند کرتے ہیں۔ لیکن جس وقت سماج کی بنیادی تبدیلی کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس وقت یا تو وہ عقل دشمنی کا اظہار کرتے ہیں۔ شعور کو حقیر گردانتے ہیں اور وجدان میں پناہ ڈھونڈھتے ہیں یا سارتر کی طرح "زندگی کی خلقی بے رحمی کو اذیت طلب طریقے پر ختم کرنے کی بات کرتے ہیں یا نٹشے کی طرح برہنہ اقتدار اور طاقت سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ سائنسی نقطۂ نظر سے ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ عقل دشمنی کی نقاب کو چاک کر کے دانشِ محل تعمیر کرے۔ سماج کے تضادات اور گرتے ہوئے طبقات کی ساکھ کو ختم کرنے میں ان قوتوں کے ساتھ یکسر اپنا رشتہ جوڑے جو اپنا تاریخی مشن دنیا کے افق پر پورا کر کے "ہر کلی کے مسکرانے" کے حق کے لئے لڑ رہے ہیں اور فصلِ بہار اک کے گلاب اُگا رہے ہیں۔ بورژوا ادیب حالات کے دباؤ سے مزدور اور انقلابی قوتوں کے حق میں نعرہ تو لگاتے ہیں کیونکہ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ جھونپڑیاں پھیل کر وسعتِ ارض پر شرق سے تا غرب چھا گئی ہیں۔ تو وہ مدھم آواز میں ان تیز رو قوتوں سے ، احتجاجی ، رشتہ ضرور جوڑ لیتے ہیں۔ لیکن جب اشتراکِ عمل کا وقت آ پہنچے، اقتدار کے جبر و استبداد کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جرأت اظہار چھین لی جاتی ہے۔ فکر پابہ زنجیر ہوتی ہے تو یہ ادیب "خاموشی" کے ساتھ بالائی قوتوں سے جڑ جاتے ہیں لیکن "کاغذی پیراہن" عوام کی دوستی کا ضرور لگائے رکھتے ہیں۔ یا "غیر جانبدار" رہ کر ملکی سیاست سے دوری کی تلقین شروع کر دیتے ہیں جو تصوراتی سطح پر بالائی طاقتوں کے مفاد میں ہوتا ہے۔

فکری اعتبار سے جوش ابتدا ہی سے مستحل بردار قوتوں کے سامنے جاگیردار اور سرمایہ کی قوتوں سے برسرپیکار ہیں۔ ابتدا میں انکی محبت شوریدہ سر ہے لیکن ثابت قدم ہے۔ وقت کے ساتھ یہی فکر ٹریکٹر کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو نیچے کی مٹی کو اوپر اور اوپر کی مٹی کو نیچے کی تہوں میں دبا دیتی ہے۔ پیداواری رشتوں کی نوعیت بدل دیتی ہے فکر کے افق پر نئے سورج کو طلوع کر دیتی ہے۔ جوش کی نظم "حرفِ آخر" اردو تاریخ میں ایک نئے نشان منزل کا پتہ دیتی ہے۔ جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ مادی فلسفہ ، حیات کی روشنی میں اتنی بلیغ ، سیال اور فکر انگیز نظم اردو ادب کے دامن میں گوہرِ بے بہا ہے جسے صرف جوہری پرکھ سکتا ہے پتھروں کے خریدار نہیں ۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ شعور ارتقا پذیر ہے ـــــ جوش نے سیاسی و سماجی تحریکوں سے جڑ کر ذہنی ارتقا کی کئی منزلیں طے کیں۔ سیاسی تحریک جس وقت ہیجانی کیفیت سے گذر رہی تھی اس وقت انہیں " انقلاب مٹھیوں میں افشاں " لئے نظر آیا لیکن جس وقت محنت کش عوام نے جنگ کے ہتھیار سجا لئے ۔ آتش کار زار کو بھڑکا دیا۔ اور حق کے پیا سے گھاٹ کے نزدیک آ پہنچے تو جوش کے شعور نے بھی کروٹ ـــــ انہوں نے مادی فلسفہ حیات کی روشنی میں آزادی و انقلاب کا تجزیہ کیا۔

مادی نظام حیات زمین پر حسن و محبت کی اشرفیاں لٹانا اور بدی کی سماجی قوتوں کو مٹانے کا دوسرا نام ہے ـــ جوش کی ہر سطر حسن و محبت کی شیدائی ہے ۔ حسن خواہ محبوب کی شوخی میں ہو یا کنول کے پھول میں ، مونا لیزا کی لازوال مسکراہٹ میں ہو یا سفیدے کے درخت کے تلے جھولتے ہوئے دو مہکتے ہوئے بدن میں ۔ جس حسن سے انسانی روح تازہ ، منظم اور کومل بنتی ہے وہ انہیں عزیز ہے ۔

لیکن جوش کا تصورِ حسن و محبت صوفیائے کرام کی غیر طبقاتی سوچ سے مختلف ہے۔ اس محبت کا رشتہ درد میں گندھا ہوا ہے ۔ جو رنگ و نسل سے بلند افق تا بہ افق پھیلا ہوا ہے جس کی راہ میں پہاڑ اور دریا حائل نہیں ہے ۔

" شاعری مشاہدہ نہیں مجاہدہ بھی ہے " انہوں نے ہر موڑ پر اس کا حق ادا کیا ہے ۔ ان کا تصورِ حسن قوتِ تخلیق کا مظہر ہے۔ جو جمالیاتی قوتوں کو ابھارتا ہے جمالیات کو بھی سماجی قدر تسلیم کرتا ہے ۔ لیکن جب اسی حسن و محبت کی راہ میں سرمایہ و سامراج کی قوتیں خار دار جھاڑیاں بچھاتی ہیں ـــــ اسے ناہموار گھاٹیوں میں اتارتی

ہیں ۔ لیشرت وبا زویرنیل کے نشانات ڈالتی ہیں۔ اسے نفاق کے اندھیرے کنوئیں میں ڈھکیل دیتی ہیں۔ جہل کے بگولوں سے لقمۂ اجل بنواتی ہیں۔ توجوش کے شعور میں شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اس ہیمانہ نظام حیات کے بخیے یوں ادھیڑ دیتے ہیں جیسے درزی پرانے کپڑے کی سلائی ادھیڑ دیتا ہے ۔ اسے اس کا غم نہیں ہوتا کیونکہ وہ نیا لباس تیار کرتا ہے ۔

حضرت جوش ملیح آبادی ۔ بیگم دولت ہدایت اللہ ۔ محترمہ عفت بلگرامی ۔ منور عباس ایڈوکیٹ پروفیسر نیر نقوی ۔ محترمہ صغرا جعفری ۔ محترمہ بیرسٹر زہرا سندے حسن

جوش کی آزادی و انقلاب کی دستاویز کو سامنے رکھ کر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا انقلاب کے متعلق تصور کیا تھا؟ آیا وہ اپنے طفیلی طبقے کے مفادات کے اسیر حکمرانوں سے رشتہ جوڑے انکی قصیدہ خوانی کر رہے تھے؟ یا وہ اپنے طبقے کی روایات کہنہ، مفاداتِ ناجائز اور نظریات فرسودہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیے عوامی مفادات اور عوامی جدوجہد سے جڑے ہوئے تھے؟ آیا انکی انقلابی بصیرت، عقلیت پسندی اور فلسفۂ تغیر پر ایمان رکھتی ہے؟ زندگی کی حقیقتوں کو بدلنے پر زور دیتی ہے اور آرٹ، ادب، مذہب، زبان، کا استعمال زندگی کو بدلنے اور خوبصورت بنانے کے لئے کرتی ہے۔ یا وہ سماج میں انقلاب عزت کے فلسفے کے تحت لانا چاہتے ہیں اور مستقبل کی لگام ماضی کے ہاتھ میں دینا ضروری سمجھتے ہیں؟ یا فلسفۂ مادیت کی روشنی میں معاشیات میں انقلاب لانے کو انقلاب گردانتے ہیں؟ ان سوالات پر غور کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ہم پہلے لفظ انقلاب اور اس کے معنی پر غور کر لیں۔

انقلاب سائنسی اور پیچیدہ عمل ہے۔ انقلاب خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی تہہ میں اقتصادیات کی گتھیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ سیاسی و معاشی آزادی ایک ہی جدوجہد کے دو رخ ہیں۔ غلام ملک میں اس کی سیاسی نوعیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ ایک بادشاہ کی جگہ دوسرے بادشاہ کا تخت پر بیٹھ جانا یا ایک فوجی کی جگہ دوسرے فوجی کا مسند نشین ہو جانا اور " ظل اللہ " کا رتبہ حاصل کر لینا تبدیلی تو ہو سکتا ہے لیکن انقلاب نہیں۔ کیونکہ لفظ انقلاب وابستہ ہے معاشی اور سیاسی و سماجی تبدیلی سے۔

طبقاتی سماج میں معاشی و سیاسی لڑائی دو طبقوں کے درمیان ہوتی ہے۔
ایک طبقہ جو ظلم کرتا ہے۔ دوسرا ظلم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ ایک زندگی کو راکھ بناتا ہے دوسرا
راکھ سے اجالا پھیلاتا ہے۔ کامیاب انقلاب وہ ہوتا ہے جہاں محنت کش طبقہ استحصالی
طبقے کو شکست دیکر برسر اقتدار آتا ہے۔

تاریخ میں انقلاب فرانس اور انقلاب روس کو سنگ میل گردانا جاتا ہے۔
پہلے نے جاگیر داری نظام کی بیخ کنی کی اور نئے پیداواری رشتوں کو جنم دیا۔ دوسرے نے
سرمایہ داری نظام کی قبا کو تار تار کیا اور محنت کے ماتھے پر تاج باندھ دیا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے
مادی فلسفے نے تاریخ میں پہلی مرتبہ معاشی فلسفہ حیات دیا۔ جس کی بنیاد پر
انقلاب روس برپا ہوا۔ ــــ لینن نے اس فلسفہ، حیات پر یہ اضافہ کیا کہ عوام کی لڑائی
محض معاشی نہیں۔ ان کا حق آرٹ اور کلچر تہذیب کے خزانوں پر بھی ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ یہ آرٹ
اور کلچر استحصالی قوتوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیئے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کوئی بھی انقلاب کسی ایک فرد کا مرہون منت نہیں
ہوتا۔ کسی بھی طبقاتی معاشرے میں جس وقت طبقاتی تضاد گہرا اور تیز ہوتا ہے
اسی تیزی کیساتھ انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے ــــــــــ "زمانہ
پھر بیل گاڑی کے بجائے بھاپ کے انجن کی رفتار سے چلنے لگتا ہے۔"

پہلی جنگ عظیم کے بعد وطنیت کی تحریک نے باقاعدہ فلسفے کی صورت اختیار کر
لی تھی۔ دنیا کی ہر قوم نے اپنا تشخص اور اپنی دریافت کا کام شروع کیا۔ چنانچہ اس فکر نے
کبھی ایک خطے اور کچھ دوسرے خطے میں اپنا پرچم بلند کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کا بہت بڑا حصہ یعنی روس ایک عظیم الشان انقلاب
سے ہمکنار ہوا۔ اس انقلاب کے اثرات ہندوستان کی زرخیز زمین نے بھی قبول کئے۔
سیاسی سطح پر رجعت پسند اعتدال پسند بنے اور اعتدال پسند انقلاب پسند۔ انقلاب و

آزادی کی بڑھتی ہوئی تحریک کے نتیجے میں برطانوی سامراج نے جو کھلے اختیارات حاصل کر چکا تھا اپنے دانت اور مضبوط کیے۔

کسی بھی حکومت کا کردار اور اس کا سماجی ڈھانچہ پیداواری رشتوں سے پہچانا جاتا ہے ۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے ہندوستان کا زرعی معاشی نظام فرسودہ ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے جو صنعتی دور میں داخل ہو چکے تھے انہوں نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی خاطر جاگیردار طبقے سے سازباز کی تھی۔ صنعتی ترقی کے قدم روک دیئے تھے ۔ جاگیرداروں کے پروردہ مولوی ، ملا اور فضیلان دین کو مذہبی منافرت پھیلانے کے لئے نہ صرف استعمال کیا تھا۔ بلکہ مسلم و ہندو، مسجد و مندر، کی چوکھٹ پر گلی کوچے کو لہولہان کیا تھا۔ گورکی نے عیسائی چرچ کی رجعت پرستی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ۔

" عیسائیت ہی تھی جس نے ہزاروں لاکھوں جاہل راہب پیدا کیے، جو دیوتاؤں کی طاقت سے خوف زدہ ہو کر انسانوں کو تارک الدنیا ہونے پر اکساتے ۔ اور ان میں بدترین توہمات پیدا کرتے ۔ اور جو لوگ مخالفت کرتے ، انہیں ، کافر، کہا جاتا ۔ اور کھجور سے باندھ کر جلایا جاتا ۔ ہندوستان میں انگریزوں نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے عوام کو مختلف گروہوں اور برادریوں میں تقسیم کیا تاکہ طبقاتی نظام جوں کا توں باقی رہے

گورکی نے طبقاتی نظام کے متعلق لکھا ہے کہ " طبقہ داری اسٹیٹ چڑیا خانے کے نمونے پر بنائی جاتی ہے جس میں تمام جانور لوہے کے پنجروں میں بند کئے جاتے ہیں ۔ ان پنجروں کی تعمیر پر بڑی قابلیت صرف کی جاتی ہے ۔ تاکہ انسان مختلف گروہوں میں بٹے رہیں ۔ اور انہیں اپنے مفاد کا احساس نہ ہونے پائے اور نا ہی ایسا کلچر پیدا ہو جو تمام انسانوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے ۔ "

گورکی ۔ صد ۱۰۲ " شخصی آزادی کہاں "

بہر حال انگریزوں نے اپنے پنجے گاڑے۔ ہندوستان کی گل بہار زمین پر رنگ حنا پھیلایا۔ ٹوٹے ہوئے ہاتھ، ریگزار کے اٹھتے بگولے۔ دل کے گرتے ہوئے ٹکڑے اور سسکتا ہوا نوجوان شعور حق کی آواز بلند کرتا رہا۔ انقلاب کو آواز دیتا رہا۔ اپنے خون کی لالی سے مادر وطن کی مانگ سیندور سے بھرتا رہا۔ تاکہ لوہے کی چادر ریشم کا پلو بنے چلچلاتی دھوپ چاندنی بنے اور جھکڑ باد صبا میں بدل جائیں۔

انقلاب کا لفظ اردو فارسی شاعری میں نیا نہیں ہے۔ ابتدا میں یہ لفظ محض تبدیلی کے معنی میں استعمال ہوا۔ حافظ نے اسے تبدیلی کے معنی میں اس طرح استعمال کیا۔

ز انقلاب زمانہ عجب مدار کہ چرخ

ازایں فسانہ وافسوں ہزار دارد یاد

اردو ادب میں میر تقی میر نے بھی لفظ "انقلاب" کو تبدیلی کے معنی میں استعمال کیا

شاید کہ قلب یار بھی کچھ اس طرف پھرے

میں منتظر زمانے سے ہوں انقلاب کا

سیاست کی طرح ادب میں بھی انقلاب سے متعلق دو رجحانات صاف نظر آتے ہیں۔

۱۔ ایک وہ ادیب جو گاندھیائی "عدم تشدد" عینیت، اور اصلاح پسندی کے راستے انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

۲۔ دوسرے وہ ادیب جو عقل و منطق کو رہنما قرار دیکر مادی فلسفہ تغیر کی روشنی میں انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔

اصلاحی، و مثالی نظریے کی چھوٹ ادب پر بہت دور تک پڑتی ہے۔ پریم چند حقیقت نگاری کا امام، عوامی قوت گویائی کا خسرو اور ہندوستانی زندگی کا ستنا ور تھا۔ جس نے اپنے خطبۂ صدارت ۱۹۳۷ میں یہ شمع روشن کی تھی کہ " ہماری کسوٹی پر وہی ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو۔ حسن کا جوہر ہو۔ تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں

کی روشنی ہو ۔ جو ہم میں حرکت ، ہنگامہ ، اور بے چینی پیدا کرے ، سلائے نہیں ۔ کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی ۔

• خطبہ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین ،

لیکن اس حقیقت نگاری کے باوجود وہ اپنے دامن کو اصلاحی نظریے اور مثالیت پرستی سے بچا نہ سکے ۔ " پریم آشرم " اس کا بین ثبوت ہے ۔ جہاں قلب ماہیت کے ذریعے برے اچھے ہوجاتے ہیں ۔ بھیڑ اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں اور ایک خوبصورت دنیا آباد ہوتی ہے ۔

پریم چند کی فکر میں تضاد اور خامی اس عہد کی تھی جس میں وہ سانس لے رہے تھے ۔ جہاں طبقاتی کشمکش کو نظر انداز کر کے سماجی مسائل کا حل انتہا داوی نظریات اور مثالیت کی چھایا میں سیاسی و سماجی سطح پر سیاسی رہنما تلاش کر رہے تھے ۔

ٹیگور ہندوستان کا وقار ، اور آزادی کا نشان تھے ۔ ان کے یہاں دولت کی فراوانی بھی مذہبی گھرانے کی روایات کا احترام تھا ۔ لیکن آزادی کی لڑائی میں مثالیت پرستی کی چھایا انکی حقائق بینی پر ہمیشہ شب خوں مارتی رہی ۔ انہوں نے خیال اور حقیقت کے تضاد کو اپنے مخصوص فکری تانے بانے کے ذریعے حل کرنے کی یوں کوشش کی ۔

" میرے نزدیک مذہب ایک بے حد ٹھوس حقیقت ہے ۔ میں اس کے عکس کو آسمان ، ہوا . . . . ہر جگہ محسوس کرتا ہوں ۔ بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب ساری دنیا مجھ سے باتیں کرتی ہے ۔ "

اس میں شک نہیں کہ انہوں نے مادی زندگی کے حقائق کو نظر انداز نہیں کیا ۔ زندگی کی کامراں قوت سے انکی فکر مالامال ہے ۔ امن و آشتی کے وہ دلدادہ ہیں ۔ ۱۹۳۷ میں فرانکو کے وحشیانہ حملے میں ان کی تڑپ انسان کے لئے قابل صد تحسین ہے ۔ انسان دوستی ان کا مسلک حیات تھا ۔ بورژوا سماج پر انکی تنقیدی کتاب " تہذیب کا بحران " ان کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کو سمجھنے

میں مدد دیتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انکی نگارشات سے اس بات کا تاثر ملتا ہے کہ انکی عینیت پسندی نے انہیں عوام سے دور اور " ممتاز " انسانوں کے درمیان رہنے پر مجبور کیا۔ گو وہ سامراج کے دشمن تھے۔ ہر قومی بحران میں عوام کے ساتھ رہے۔ لیکن انہوں نے اپنے مادی ماحول کے وجود کو اپنے ردِ عمل کے تابع کرنا چاہا جو انکی عینیت، اور مثالیت پرستی پر دلالت کرتی ہے یہ تضاد سیاسی ومعاشی سطح پر تھا۔ " مادے " اور " خیال " میں تھا جسے وہ حل کرنے سے قاصر رہے۔

پیخانوف نے اپنے مقالے " **آرٹ اور سماج** " میں لکھا کہ " انیسویں صدی کے رومان پسند ادیبوں کو بورژوا سماج کی غلاظت اور اس کے مہاجنی پن کا احساس تھا۔ انہوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا۔ لیکن انکی تنقیدوں سے بورژوا سماج کو ذرہ برابر خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ انقلاب کے حامی نہیں تھے۔ بورژوا سماج باقی رہے لیکن بورژوا طور طریقے اور اخلاق کی چیرہ دستیاں ختم ہو جائیں "

اقبال ہمہ گیر جہت کا شاعر تھا۔ متحرک اور مترنم زندگی کا نغمہ گو تھا۔ سامراج کا دشمن تھا۔ " آزادی کے نیلم پری " کے سرخ کا شناسا تھا۔ انقلاب روس کا دلدادہ تھا۔ " لینین کو بھی خدا کے حضور " پہنچانے کا مشتاق تھا۔ " بانگ درا " اور " پیام مشرق " کی نظموں میں سامراج دشمنی کھل کر سامنے آتی ہے۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

اقبال نے پہلی مرتبہ لفظ انقلاب کو سماجی و معاشی تبدیلی کے معنی میں اردو شاعری میں روشناس کرایا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنی اصل منزل پر آ گئے۔ اور یہ الفاظ تحریر فرمائے۔

"ہر نئی دنیا سب سے پہلے انسانوں کے ضمیروں میں متشکل ہوتی ہے۔"

"دیباچہ پیام مشرق"

اسی فکر نے خودی کا غیر انقلابی نظریہ دیا۔ عذیت پرستی و ماضی پرستی میں مسائل زندگی کا حل تلاش فرمایا۔ "ماضی کی لگام ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ہماری لگام ماضی کے ہاتھ میں نہیں ________" اقبال کی فکر میں تضاد اپنے عہد کا تھا۔ رجعت و ترقی کی قوتیں آپس میں اس طرح گتھ گئی تھیں۔ ان کا تجزیہ آسان نہیں تھا۔ انکی تحلیل اس وقت ممکن نہیں تھی۔ لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود اقبال کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے۔

"طالستائی" سے متعلق اپنے ایک مضمون (۱۱ ستمبر ۱۹۰۸ پرولتاری) میں لینن نے لکھا کہ "طالستائے مسلک کی تصانیف میں اور تعلیمات میں سچی بات یہ ہے کہ بڑے نمایاں تضاد ہیں۔"

"ایک طرف وہ باکمال ادیب ہے۔ جو سرمایہ داروں کی لوٹ کی مخالفت کرتا ہے۔ محنت کشوں کی غربت اور امارت کا تضاد پیش کرتا ہے۔ دوسری جانب "بدی سے عدم مزاحمت" کا پرچار کرتا ہے ...... وہ ملائیت کو فروغ دیتا ہے۔" ...

"مادر روس"

تم جتنی تنگ حال ہو اتنی ہی دھنوان

تم جتنی طاقتور ہو اتنی ہی بے یار و مددگار"

طالستائی کے یہاں یہ تضادات اس تحریک کے تھے۔ جو انقلاب کیلئے چل رہی تھی کمزوری دراصل اس کسان تحریک میں تھی جسکے پاٹ میں مزدوروں کا شعور

شامل نہیں ہوا تھا۔ زمیندار سے نفرت کرنا تو "کسان بھاؤں" نے بتایا تھا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان کو ہٹانے کا تحقیقی راستہ کیا ہے۔ اس لیے کسانوں کے اقلیتی طبقے نے انقلاب کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ تو لیا لیکن دوسری طرف اکثریت غرضی تھی۔ دعائیں مانگتی اور اخلاقی نعائم کرتی رہی۔ طالستائی کے یہ خیالات بھی ان متضاد تاریخی حالات کا پرتو ہیں جس کے دائرے کے اندر وہ سانس لے رہا تھا۔"

فکری اعتبار سے جوش مادی فلسفۂ حیات سے قریب تھے۔ عینیت پرستی سے انہوں نے پرہیز کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں تضادات ہیں۔ تثنیث کی فکر کا پرتو، فلسفہ "جبر و قدر" کی جانب میلان۔ یہ سب باتیں یقینی طور پر ہیں۔ لیکن ان کی مادی فکر عقل پرستی ہے۔ عینیت اور چھایا واد سے بچ کر نکل آنا ان کی عقل پرستی کا نتیجہ ہے۔

"عام طور پر بورژوا سماج میں فلسفے اور ادب کا بنیادی نظریہ عقل دشمنی ہے۔ کیونکہ حالات پر جب قابو نہیں ہوتا اس وقت اس بورژوا ادیب کو حقیقت عقل کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تنزل پذیر سماج کی تباہ کاریوں سے زیادہ تبدیلی سے ڈرتے ہیں۔ اور سماج کے خول کے اندر سے باہر نکل کر پورے ڈھانچے کو دیکھنا پسند نہیں کرتے ......"

"ادب اور فاشزم"

جان اسٹریچی

فلسفۂ "عینیت کیمطابق" ادیب کو آفاقی انسان کے لئے لکھنا چاہیئے۔ جو زمان و مکان سے آزاد ہو"۔ جوش نے "آفاقی انسان" کی تلاش نہیں کی۔ کیونکہ جب تک دنیا میں

طبقات اور طبقاتی آویزش موجود ہے وہاں "آفاقی انسان" تلاش کرنا دراصل غیر جانبداری کا اعلان اور ظلم پر پردہ ڈالنا ہے۔ جوش اپنے ارادے، نیت اور عمل میں اس انسان کے سامنے جوابدہ ہیں جو دھرتی کے سینے سے لگ کر چلتا ہے۔ ذی شعور ہے۔ انقلاب کا ہراول

دستہ ہے۔ وہ سامراج دشمنی اور عوام دوستی کی جنگ میں اس نظریے کے قائل ہیں۔

گہہ عطر میں ڈوبے ہیں کبھی خون میں تر ہیں
جس کے ہیں بس اسکے ہیں جدھر ہیں بس ادھر ہیں

ہندوستانی سیاست نے بارہا سامراج سے آنکھ مچولی کھیلی۔ کبھی مثالیت پرستی، کبھی انتہا داد، کبھی اصلاحی، کبھی انقلابی، کبھی سمجھوتہ کبھی مصلحت بینی۔ لیکن جوش نے سیاسی وتہذیبی بساط پر سیاسی رہنماؤں سے سر نہیں جوڑا۔ بلکہ عوام سے دل جوڑا۔ انقلاب کے شعلوں کو لبیک کہا۔ ایک طرف وہ ترانۂ انقلاب کا ترانہ عوام کے ساتھ مل کر گاتے رہے۔

وہ تازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار
وہ سنسنائی آگ وہ اڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ وہ غلطاں ہوا غبار
اے بے خبر وہ آگ لگی آگ ہوشیار
بڑھتا ہوا فضا پہ قدم مارتا ہوا
بھونچال آرہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

اور دوسری جانب وہ انتہا دادیوں کی دعاؤں اور "مثالی فکر" کا اس طرح مذاق اڑاتے رہے۔ جنہوں نے عوام کے بڑھتے ہوئے قدموں میں انقلاب کے خوف سے زنجیریں ڈالدیں تھیں۔

دل کانپ رہا ہے التجاؤں میں ہنوز
اک کیف ہے بھگتی کی صداؤں میں ہنوز
دم توڑ چکا ہے آسمان پر بھگوان
گاندھی مصروف ہیں دعاؤں میں ہنوز

کسی بھی فنکار کا شعور بنا بنایا نہیں ہوتا۔ شعور کو تاریخ اور سماجی حقائق سے علیحدہ کر کے دیکھنا غیر سائنسی ہے۔ شعور ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر ہر دور کے ترقی اور غیر ترقی یافتہ کے ترقی اور غیر ترقی یافتہ میلانات کو تولا جا سکتا ہے۔ فنکار کا کسی طبقے میں پیدا ہو جانا اس کے ترقی اور رجعت پسند ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ دیکھنا یہ اہم ہے کہ اپنے عہد میں وہ فنکار ترقی کی قوتوں کے شعور سے کیا ہم آہنگ ہے؟ ان کے حقوق کا نگراں ہے؟ یا رجعت پرست قوتوں کا ساتھ دیکر مستقبل کی قوتوں کی تقدیر ماضی کے دھندلکوں سے باندھ رہا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی و تہذیبی بساط پر سامراجیت کے سامنے جب بڑے بڑے ادارے کانپ کر گر چکے تھے۔ گرج دار آوازیں دب کر ٹوٹ چکی تھیں۔ حوصلے زمین پر آ چکے تھے۔ بہت سے لاج بھری کنواریوں کی طرح مالیوں بیٹھ گئے تھے۔ کچھ حجروں میں "اللہ ہو" کر رہے تھے۔ کچھ ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے تھے۔ بالائی قوتوں سے کتنا رشتہ جوڑا جائے؟ سامراجیت کی کتنی مخالفت مول لی جائے۔؟ مفادات کا سودا کیسے اور کس طرح ہو؟ عوام کے حقوق بازار میں مفادات کی کسوٹی پر تولے جا رہے تھے۔ ایسے وقت میں جوش آگ کے دریا میں تپ کر کندن بن رہے تھے۔

۱۔ انقلاب کی پہلی ضرورت ان سماجی قوتوں سے رشتہ جوڑنا تھا جو فرقہ واریت کے خلاف جہاد میں مصروف متحدہ قومیت کے اصولوں کو بڑھاوا دے رہی تھیں۔ تاکہ متحدہ محاذ اور قوت سے ان استحصالی قوتوں کی بیخ کنی کی جائے جو پیچیدہ سحر کے خلاف مورچہ لگائے کھڑی تھیں اسے سامراج کو دیس نکالا دیا جا سکے۔ جاگیر کے پروردہ ملا، مفتی، ذاکر، جوش کے تیروں سے چھلنی تھے۔ ان کا قلم جاگیرداروں پر بھی آگ برسا رہا تھا۔ جس کا تفصیل سے تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں جوش اپنے سماجی شعور کی بنیاد پر اس طبقے کے انقلابی شعور سے ہم آہنگ تھے۔ جو فرقہ پرستی کی لعنت سے آزاد ہو کر غلامی پر آزادی کو ہر قیمت ترجیح دے رہا تھا۔

سنو اے بستگان بزم گیتی
ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاودداں سے

۲۔ دوسری بات یہ کہ جوشؔ نے فرقہ واریت کے زہر کو کھینچ کر اس میں محبت کی شیرینی گھولی تاکہ غلام ہندوستان آزاد ہو۔ انہوں نے ان سیاسی قوتوں کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کیا جو آزادیٔ ہند پر اپنا سب کچھ قربان کر چکی تھیں۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ دنیا کی تاریخ کا اہم ترین باب تھا۔ جوشؔ اس کی ہر کروٹ میں شریک تھے۔ اس طرح قومی انقلاب برپا کرنے میں ان کی انقلابی فکر صحیح خطوط پر گامزن تھی۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ انقلابی فکر سے آراستہ ذہن کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ ان قوتوں پر نگاہ رکھے اور ان طاقتوں کا تجزیہ کرے جو "آزادی" کے پس پردہ "طوطی" کا کام انجام دے رہی تھیں جن کے ہاتھوں ہر ماں کا سینہ شگاف تھا۔ طور در آغوش زمین پر لہو کا دریا بہہ رہا تھا۔ سرمایہ و جاگیر کی قوتوں نے کس طرح سامراج کے اشارے پر لاشوں پر گھوڑے دوڑائے۔ جوشؔ کی انقلابی فکر نے اس کے نقش یوں دریافت کیے۔ اس کے اسباب و علل کے رشتے یوں رقم کئے

شاخیں ہوئیں دونیم جو ٹھنڈی ہوا چلی — گم ہو گئی شمیم جو بادِ صبا چلی
انگریز نے وہ چال بجور و جفا چلی — برپا ہوئی برات کے گھر میں چلا چلی
خونِ چمن بہار کے آتے ہی بہہ گیا
اترا جو طوق اور بھی دم گھٹ کے رہ گیا

جاگیردار و سرمایہ دارانہ نظام لاکھوں انسانوں کو بیکار کرتا ہے۔ بے شمار لمپن قسم کے عناصر کو پیدا کرتا ہے۔ جو جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ جنہیں سرمایہ پرست قوتیں انقلابی طاقتوں کے مقابلے پر استعمال کرتی ہیں ان کا تعلق حکمران قوم کی پولیس اور فوج سے ہوتا ہے۔ ہر جگہ فسادات کرانے میں انہیں پیش پیش رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ برطانوی سامراج نے ان عناصر کو پیدا کیا اور فسادات کے دوران انہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔

گورکی نے یہود دشمنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "زار روس نے اپنے طبقاتی مفاد کے لئے یہود دشمنی کو استعمال کیا۔ اور عوام نے یہودیوں کا قتل اسی بنا پر کیا۔ عوام جو اپنی مفلسی کی وجہ سے مشتعل تھے۔ اور جن کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ وہ اپنے اصل دشمن کو دیکھ نہ سکے۔ اگر حکام یہودیوں کے قتل کی اجازت دیتے ہیں تو انہیں کیوں نہ لوٹا جائے" ہندوستان میں بالکل یہی ہوا۔ اگر قومی رہنما، والیانِ ریاست، جاگیردار سرمایہ دار، فوجی افسر اور مذہبی رہنما دوسرے فرقے کے قتل کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو انہیں کیوں قتل نہ کیا جائے۔"

جبکہ "مسئلہ کو الجھائیے مت" محمد مہدی

جوش صاحب کی نظر پختہ، اور ذہن آہنی دلائل سے مزین تھا۔ فسادات کی تہہ میں کونسی قوتیں کارفرما ہیں۔ ان کی نگاہ میں تمام "رازہائے سربستہ" واضح تھے اس منزل پر سیاسی رہنما خاموش تھے۔ مفادات پر "ضرب" لگنے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن جوش صاحب کا قلم جو سچائی کا علمبردار، انقلاب کا شیدائی اور عوام کی محبت سے سرشار تھا۔ ان قوتوں کی یوں نشاندہی کر رہا تھا۔

برطانیہ کے خاص غلامانِ خانہ زاد — دیتے تھے لاٹھیوں سے جو حبِ وطن کی داد

جن کی ہر ایک ضرب ہے اب تک سروں کو یاد — وہ آئی سی ایس اب بھی ہیں خوش وقت و بامراد

شیطان ایک رات میں انسان بن گئے

جتنے نمک حرام تھے کپتان بن گئے

بہر حال آزادی کا پہلا مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ ترقی پسند قوتوں اور مزدور طبقے میں تنظیم کی کمی کی وجہ سے اقتدار بورژوا سیاست دانوں کو سونپا جا چکا تھا۔ انقلاب کا دوسرا مرحلہ کو عوامی آمریت قائم ہو۔ ہنوز دلی دور است، کی منزل پر تھا۔

حضرت جوش ملیح آبادی۔ سامنے محترمہ زہرا مہدی (دہلی) مسز رقیہ باقر فیض کے نکتہ سنج
میجر اطہر عباس۔ مسز میجر زیدی۔ ریسرچ اسکالر شیریں عباس۔ پرستار جوش محترمہ رباب ہادی
نقوی، پروفیسر نشاط کاظمی۔ مسز ونگ کمانڈر شاہد۔ ڈاکٹر مہر حسن

انقلاب (عملی پہلو)

فرانس کے ممتاز مفکر "ژاں پال سارتر" کا کہنا ہے کہ " اگر انسان معاشرے کی تاریخ اور معاشیات کی جدلیات سے ناواقف ہے تو عصر حقائق کے بارے میں اس کا جذباتی ردعمل خواہ کتنا ہی صحیح ہو۔ اسے باہر کی دنیا تو کیا اپنے اندر کے کھرے اور کھوٹے کا پتہ نہیں مل سکتا ـــــ تذبذب اور بے یقینی اس کی تحریروں میں ملے گی "

معاشرے کی جدلیات سے واقفیت کے نتیجے میں شاعر عصری صداقت کے آئینے میں ابھرتی، مٹتی، ٹکراتی عوامی جدوجہد کو طبقاتی کشمکش کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان و فطرت، معاشرہ اور طبقات، پیچ در پیچ قدروں، امنگوں اور عقیدوں کے تمام رخ واضح ہو جاتے ہیں ـــــ وہ بکھری ہوئی عصری حقائق کی تمام جہتوں کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کی درستگی اور نادرستگی کا جائزہ بھی لیتا ہے۔

خطاط ہو یا نقاش، مصور ہو یا شاعر اس کی فکر کی اساس کسی نہ کسی نظریۂ حیات پر ہوتی ہے۔ لیکن فنکار کے کسی نظریے کو اپنانے کے معنی منظوم مرلوط پیش کرنے کے نہیں ہیں ۔ بات صرف اتنی ہے کہ شاعر یا ادیب جس وقت انسانی تجربات کی روح کو اپنے احساس کی بھٹی میں کندن کرتا ہے تو اس کا تجربہ کسی نقطۂ نگاہ کا پابند یا اس سے متاثر اور ہم آہنگ ضرور ہوتا ہے۔ جسے وہ فنی پیکر عطا کرتا ہے۔

یہاں سے فن میں جانبداری اور غیر جانبداری کی لمبی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

عظیم انقلابی شاعر ڈیوڈ کے الفاظ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ " سیاست یا ادب میں غیر جانبداری کا کوئی وجود نہیں ۔ ۔ ۔ اگر ایک شخص عملی طور پر ایک سیاسی نظام کی مخالفت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی تائید کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ تمام انسان ایک دوسرے سے ہزاروں سماجی اور اقتصادی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح سوچنا کہ یہ بندھن موجود نہیں ۔ ۔ ۔ اور اپنے آپ کو تمام انسانوں سے علیحدہ سمجھ کر ادب اور فنونِ لطیفہ کی بات کرنا جبکہ انسان طبقاتی نظام کے تلے کراہ رہا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسانیت سوزی ہے ۔

خوبصورت زندگی کی آرزو اور نئے اقدارِ حیات کی تلاش میں انسان نے ہر عہد میں کبھی خیالی اور کبھی عملی زندگی میں نئی پیکرِ شیریں تراشنے کی کوشش میں پہاڑ کا سینہ چاک کیا ہے تاکہ ناتراشیدہ آرزوئیں خوشیوں کا سہرا آبشار اور نارسیدہ امنگیں فصلِ بہاراں کی گلاب باڑی بن جائیں ۔ زندگی اور ترقی کے اس تسلسل کو خواجہ الطاف حسین حالی نے یوں محسوس کیا تھا ـــــ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں

زندگی اور تغیر و ترقی کا یہ عمل تاریخ کی مادی تعبیر اور جدلیاتی فلسفۂ حیات میں پیوست ہے۔

انیسویں صدی سے قبل کا ہندوستانی معاشرہ جاگیرداری بنیادوں پر قائم تھا۔ سیاسی نظام اور معاشرتی ماحول چند مخصوص تصورات ، عقائد اور اقدار و نظریات میں جکڑا ہوا تھا ـــ چاروں طرف اندوہ گیں ٹھہراؤ اور سلگ سلگ کر راکھ ہونے کی کیفیت تھی۔ جس کے خلاف احتجاج اور بغاوت کی آگ یقیناً بھڑکتی۔ لیکن جلد ہی بجھا دی جاتی ـــ طبقاتی تضادات چونکہ سطح پر نمایاں نہیں تھے اس لئے تمام آلام و مصائب ، گردشِ لیل و نہار سے منسوب کئے جاتے تھے ـــ اپنی ذات ، ملک و قوم کے ماضی ، حال اور مستقبل کی کیفیات اور تغیرات کی تعبیر عموماً اسی طرح کی جاتی ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود معاشی اور معاشرتی انقلاب کی دھمک اس دور کے ادب میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

انیسویں صدی کا ہندوستان اس وقت تاریخ کی پر پیچ راہوں سے گزرا جس وقت ہندوستان کا قدیم ڈھانچہ اور نوآبادیاتی نظام جاگیرداری اور سرمایہ داری کے سنگم پر کھڑا ہو گیا ـــ معاشی تصادم کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر ٹکراؤ ہوا ۔ قدیم سے کتنا رشتہ جوڑا جائے ؟ اور جدید کو کہاں تک قبول کیا جائے ؟ سیاست و ادب میں یہ سوال فکر کا مرکز بنا ۔ جس کا جواب ہر سیاستداں

اور ادیب نے اپنے طبقاتی روابط اور فکری زاویۂ نگاہ کے مطابق دیا۔

غالب کی فکر جہل سوز اور عقل افروز تھی ـــــــ اردو ادب میں انھوں نے پہلی مرتبہ سائنسی فکر کی روشنی میں معاشرے کے روایتی تصورِ حیات و کائنات اور اس کے بنیادی مسلمات میں تشکیک کا اظہار بہانگِ دہل کیا۔ اکثر نقادوں نے غالب کے اس پہلو کی تشریح نفسیات کی روشنی میں کی ہے جو صحیح ہے ـــــــ لیکن محض نفسیاتی توجیح کافی نہیں۔ کیونکہ نفسیاتی کشمکش بھی خارجی عوامل ہی کا پرتو ہوتی ہے ـــــ غالب فلسفۂ تغیر و تبدل کے رمز آشنا تھے چنانچہ ان کا یہ لکھنا کہ "میرے بزرگوں کا یہاں آنا ایسا تھا جیسے پانی اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے ...." اپنی عظمت رفتہ کو زمانے سے منوانے کے لئے تھا لیکن وہ ماضی پرست نہیں تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ

"مردہ پروردن مبارک کار نیست"

یا "صاحبان انگلستاں را نگر"

یا "بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم"

کتنا مردہ پرستی، ماضی پرستی، فرسودہ اقدار پرستی پر چوٹ بھی تھی اور سائنسی برکات سے دامن بھرنے کی خواہش بھی۔ ـــــــ لیکن سائنسی برکات کی تہہ میں کتنی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی تاراجی پوشیدہ تھی غالب کی نگاہ اسے نہیں دیکھ سکی ـــــ جس کی وجہ یہ تھی کہ عوامی تحریکات نیم معاشی اور نیم مذہبی جامہ پہنے چل رہی تھیں۔ طبقاتی تضادات گہرے نہیں ہوئے تھے۔ باشعور طبقہ میدان میں نہیں اترا تھا۔ اسلئے "تاراجی" کے اسباب و علل کا تجزیہ کرنا اس عہد میں ممکن نہیں تھا ـــــ لیکن سماج میں تغیر کے پیچیدہ عمل پر انکی نگاہ یقیناً تھی جو انکی بصیرت اور شعور کی گواہ ہے۔

تاریخ ادب میں اقبال نے انقلاب کو سیاسی و سماجی تبدیلی کے معنی میں پہلی مرتبہ استعمال کیا جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے لیکن اس کے باوجود انھیں شاعر انقلاب نہیں تسلیم کیا گیا۔ اس کے دو بنیادی وجوہ ہیں۔

اول) " دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں "

از زمانِ خود پشیماں می شوم

در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم

کہہ کر مستقبل کی باگ انہوں نے ماضی کے ہاتھ میں دیدی۔ حالانکہ انقلابی نقطۂ نگاہ سے "مستقبل کے ہاتھ میں ماضی کی لگام ہونا چاہیے"

(دوئم) انقلاب کے لئے صرف معاشرتی تضادات سے آگہی کافی نہیں بلکہ تعمیری راستے اور منزل کا تعین بھی لازم ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں جس وقت باشعور مزدور طبقہ میدان میں اترا اور اس نے انقلابی عمل کی لے کو تیز کرنا چاہا اس وقت اقبال نے مزدور کی قصیدہ خوانی کرنے کے باوجود اس انقلابی طبقے سے رشتہ جوڑنے اور انقلابی عمل کو تیز کرنے کے بجائے 'خودی' کا غیر انقلابی فلسفہ عطا فرمایا۔ جس کے متعلق اردو کے مایۂ ناز شاعر مجازؔ نے برجستہ کہا

یہ بلبل آج شاہیں بن گئی ہے

ندی میں اب نہ طوفاں ہیں نہ لہریں

بہت گہری سہی ٹھہری ہوئی ہے

(۱۹۳۳ غیر مطبوعہ نظم)

اقبال کے اس فلسفۂ خودی کی بنیاد افلاطون کے فلسفۂ عینیت پر ہے — اقبال کا یہ فلسفہ طبقاتی نظام کے جبر سے نکالنے کا راستہ نہیں دکھاتا"... حالانکہ انقلاب کا تصور طبقاتی کشمکش سے علیحدہ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔ زندہ رہنے کیلئے " روحانی ارتقا " کی منازل طے کرنے سے پہلے سماجی نظام کی کئی ہیتوں کی ترتیب بدلنا لازم ہے۔

ان حالات میں ایک ایسے شاعر کی ضرورت تھی جو دونوں متصادم دنیا کی مادی و فکری بنیادوں سے واقف ہو — اپنے عہد کے تمام تضادات کو فکر میں Resolve

کرے انہیں چھان پھٹک کر تمام کیفیات اور واردات کی نقش گری کرے جو معاشی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر انقلاب سے قبل انقلاب کے دوران اور بعد میں انسانوں پر گذرتی ہیں۔

جوش صاحب کی فکر کا بنیادی پتھر فلسفہ مادیت ہے۔ عقل پرستی ان کا طرۂ امتیاز اور سماجی حقیقت نگاری نشان ہے۔ جو ان کی پختہ انقلابی بصیرت پر گواہ ہے۔ ان کی شاعری طبقاتی کشمکش آگاہ ہے۔ وہ خذف بیزار، گوہر پرست، شر مسمار، خیر معمار، جہاد کا سوزِ یقین انقلاب کی للکار کار گاہ رزم میں فولاد حلقہ یاراں میں ریشم۔ حق فریفتہ اور باطل کوب ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ سنجیدہ شعور کی یہ توانائی جوش صاحب کے یہاں کہاں سے آئی ہے؟ ظاہر ہے اس کا منبع وہ مادی نظریہ حیات ہے جس سے سماجی حقیقت نگاری کے در روشن ہوتے ہیں۔ زندگی کا عرفان نصیب ہوتا ہے اور ایک حسین زندگی کے جہاد میں آگ و خون سے گذرنے اور اعلیٰ مقصد کی خاطر "خرد بیزار" قوتوں سے نبرد آزما اور گرم طلب رہنے کا حوصلہ بیدار ہوتا ہے۔ ہر تجربہ خواہ وہ حسن و عشق، کا ہو یا کوئی دوسرا آج اس نے ساری صیات اور کیفیات کو سیاسی جذبے میں منسلک کر دیا ہے۔

رابرٹ فرسٹ نے لکھا ہے کہ "میں اس شاعری کا قائل ہوں جو پہلے مسرت اور پھر بصیرت عطا کرے" . . . میر نے اس کیفیت کا سراغ یوں لگایا۔

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر کسی کا نشانہ ہو

کعبے کی بزرگی احرام باندھ کر چکر کاٹنے والوں سے نہیں ہے بلکہ ان انسانوں سے ہے جن کے سینے زخموں کے بن ہیں۔ جو "برق" سے ماتم خانۂ دل کو روشن کرتے ہیں بالکل یونانی دیوتا کی طرح جو اپنے سینے کے ناسور چھپا کر دوسروں کے سینوں میں

چاندنی چھڑکاتا تھا۔

خرد بیزار، اور جہل افروز دنیا میں جہاں سچائی کی دمک، شعور کی مہک اور انکار "انکار" کی سزا میں۔ پیغمبری کو آرے سے چیرا گیا۔ مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ سقراط نے زہر کا جام پیا۔ نواسۂ رسول کی لاش پر گھوڑے دوڑائے گئے وہاں انسانی شکل میں ڈھلے ہوئے مشعلوں نے جوش کو بھی جھلسایا۔ اقوال ابہام کا ٹھرا پینے والوں نے ان پر چھریاں تیز کیں۔ قلم سے گلی ڈنڈا کھیلنے والوں نے شعور انگیز اشاروں پر پھبتیاں کسیں۔ بتیل سوچنے والوں نے چھلکے دار عقل اور کندن شعور سے گھبرا کر ان پر دروازے بند کئے اور طنز و تشنیع کے حربوں سے انہیں قعر مزلت میں ڈالنے کی سعی کی۔ "مجھے قتل کر دیا ہے بہ گنِ خوش نوائی" کی سزا دی گئی۔ لیکن ان بانوں کے باوجود جوش میدانی درخت کی طرح جھکڑوں کے سامنے کھڑے رہے۔ میدانی درخت بہت دیر تک جلتا ہے اور پتھروں کی بارش کے سامنے کجلانے کا نام نہیں لیتا۔ جوش صاحب اپنے دل میں ناسور کے گھاؤ چھپائے مسرت اور بصیرت کا جھرنا بہلاتے رہے۔

جوش صاحب حسن، محبت اور امن کے شاعر ہیں۔ لیکن ایسا حسن۔ جو ماورائے ذہن ہو۔ ان کی لغت میں حرام ہے۔ اس لئے کہ جمالیات، تصوراتی نہیں سماجی قدر ہے۔ ہر وہ شے حسین ہے جو مفید ہے۔ اس لئے ان کا حسن زمین کی کوکھ سے پھوٹتا ہے یا حسن خواہ ہتھوڑے کی چوٹ میں ہو یا مشین کی گڑگڑاہٹ میں کروٹیں لیتی ہا لہلاتی زمین میں ہو گندم کی سنہری بالیوں میں، گڑ کی بھیلی میں ہو یا انجن کی سیٹی میں فصل بونے کی گنگناہٹ میں ہو یا کمر کے لوچ میں، جسم کے خال و خط میں ہو یا رقاصہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار میں۔ حسن کی ہر ادا انہیں عزیز ہے۔ لیکن ان کے یہاں حسن کی تمام کج ادائیاں درد کے رشتے میں پیوست ہیں۔ درد جو بڑھتا ہے۔ درد جو پھیلتا ہے۔

اسی لئے جب فصل کے حسن کا تن نگار ہوتا ہے۔ رعنائی کی دھج تار تار ہوتی ہے۔ مشعل بکف سورج قتل ہوتے ہیں۔ جوان مسکراہٹ حلقہ بگوش ہوتی ہے۔ گلابوں کی بہار پا بہ زنجیر ہوتی ہے۔ پربت بھرے ہیرے نیلام ہوتے ہیں۔ درد کے مہتاب لہولہان

ہوتے ہیں۔ اس وقت جوش کے شعور پر ہتھوڑے برستے ہیں۔ احتجاج، بغاوت، اور انقلاب، قلم دہکنے لگتا ہے۔ شعلے برسانے لگتا ہے ــــــــ لیکن انقلاب کی آواز کی آواز محض للکار نہیں۔ صرف جھنکار نہیں ــــــــ محض برہمی نہیں۔ وہ "گلشنِ ناآفریدہ" کو لوٹنے والی ان تمام سماجی قوتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو اس تاجرانہ بازار کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا قلم "سرمایہ داری" "رشوت خوری" "مہاجن" "سود خوار" "طفیلی طبقے زمیندار" "عصبیت کے ناگ" "مولوی"، "ملا"، "خانقاہ"، "مسجد" "منبر" یعنی سامراج کے تمام گرگوں کو چھیل ڈالتا ہے۔ قندیلِ غم جلاکر حلقہ در حلقہ استحصالی نظام کے تار و پود بکھیر دیتا ہے۔ سامراج دشمنی کی لے تیز تر کرکے عوامی شعور سے جڑ کر انقلاب کا راستہ دکھاتا ہے۔

حیف کہ آج بھی یہی قولِ فقیہِ شہر ہے
خونِ بلاکشاں حلال، آبِ گہر چکاں حرام
آج بھی قومِ شام ہے عظمتِ صبح کی حریف
آج بھی ہے یزید کو آرزوئے سرِ امام

اہلِ کرم کے بھیس میں ایک طرف تونگری
شانہ، تختِ سیر لئے، جو دو سخا کے نرم دام
سر میں سخوم سروری، رخ پہ رقومِ دلبری
دل میں ہجومِ قاہری، لب پہ نجومِ ابتسام

راہ بری میں رہزنی، مہر میں تیرا فگنی
کبر بہ ہر فروتنی، تیغ بکفِ خم سلام

یہ احتجاج، بغاوت اور انقلابی بصیرت و ذکاوت کی ایسی بھٹی ہے۔ جو خشت کو پگھلا کر سونا بنا دیتی ہے۔ یہ احتجاج رجائیت سے پر ہے۔ جہاں بے عملی، بے یقینی، افسادگی سپردگی، کا گذر نہیں۔ یہ رجائیت نشاط خیز اور سکوں ریز ہے۔ جو سوکھی شاخوں پر پھول کھلاتی اور امید کے ان گنت جھاڑ روشن کرتی ہے۔ خوابیدہ کو بیدار اور ناآشنا منزل کو منزل آشنا بناتی ہے ——— یہ رجائیت اپنے دامن میں بیسویں صدی کا سماجی شعور لئے ہوئے ہے جو سیاسی و معاشی بیداری کا فنی پیکر میں اظہار ہے۔

جوش کا سوختہ جانوں سے درد کا رشتہ افق تا با افق پھیلا ہوا ہے "جو صورتِ گل،، "پریشاں" نہیں۔ مادی فلسفہ حیات کی منظم و مربوط لڑیوں میں پرویا ہوا ہے۔ جو انسانوں کے درمیان، اسلام، اور ہندو، کی حدیں قائم نہیں کرتا بلکہ حدیں توڑتا ہے ——— ایمان خدا پر ہو یا خدا پرستوں پر، رشیوں و نبیوں پر ہو یا رسولوں اور پیغمبروں پر، دیوی دیوتا پر ہو یا اوتاروں پر، انسانوں کا رنگِ جلا بدن ایک ہے۔ رنگ سوز گلو ایک ہے۔ رنگِ لختِ جگر ایک ہے۔ وہ شیریں ہو یا تلخ ہو یا تیز ہو۔ ان کا مسلکِ حیات مادی و روحانی عسرت سے نجات حاصل کرنا بصیرت میں حق شناسی، کردار میں استقامت، نظر میں رفعت پیدا کرنا ہے۔ اندرونی اور بیرونی طور پر صفا کرنا ہے۔ جوش نے اپنے طاؤس رقصاں قلم سے حسن کاری بھی کی ہے اور شعلگئ فکر سے رگوں میں خون کی حرارت بھی تیز کی ہے ——— علم سے مزین ان کی آواز جدید عہد کے نئے معمار کے تھوڑے کی آواز ہے جو امن، محبت اور زندگی کو اجتماعیت کی جانب لے جانا چاہتا ہے جو اپنے نغموں میں قوت و رعنائی انسانی تہذیب و ترقی کے خزینوں سے لیتا ہے۔

امن کا لفظ مجرد نہیں۔ وہ سماجی انصاف سے جڑا ہوا ہے۔ اس لئے وہ امن جس سے، محبت اور حسن کے تار جھنجھنا اٹھیں۔ بے وطن اشجار سرخرو ہوں ایوان

ہوس سرنگوں ہو ــــــ انسانیت اور امن و مساوات کا یہ تصور صوفیا کے تصورِ انسانیت سے جدا ہے ۔ جہاں موت کے بعد امیر غریب سب برابر ہیں۔ کیونکہ اس عہد میں معاشی تضادات گہرے نہیں تھے ۔ طبقاتی جدوجہد تیز نہیں تھی۔ اس لئے مساوات اور انسانی برابری کا تصور یہی تھا کہ مرنے کے بعد سب برابر ہیں ۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو پڑ گیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل ، راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پرُ غرور تھا

یہ تصور دراصل بھگتی تحریک نے عام کیا تھا ۔

سب ہیں یکساں جب فنا اک بار گی طاری ہوئی
ٹھیکرا ، اس مرتبے میں کیا سر مغفور کیا

جوش کا امن و محبت کا تصور خالص مادی ہے ۔ وہ غمناک مسکراہٹ محنت ، سچائی ، پاکیزگی ، کتاب ، گھر ، علم جو سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام میں اپنا اچھوتا پن اور تقدیس کھو دیتا ہے اسے وہ نئی سچائی ، نئی کتاب ، نیا گھر اور اس کا تقدس بخشتے ہیں ۔

انسانی محبت و عظمت سے سرشار ہو کر فنکاروں نے ہر عہد میں "انگلیوں کو فگار" اور اور سینے کو "خونچکاں" کیا ہے لیکن بات پھر بنی نہیں اس لیے ابتدا میں انسان صرف "اپنے نفس" پر ظلم کرتا تھا ۔ کیونکہ ظلم کو ختم کرنے کی راہیں روشن نہیں ہیں ۔ چنانچہ قہرِ درویشی بہ جانِ درویش کی منزل تھی ۔ انسان خاموش تھا ، مظلوم تھا محکوم تھا ۔ اس لیے کل کی انسان دوستی بھی معاشی و سیاسی سطح پر خاموش و مضمحل

ــــ لیکن آج اقدارِ حیات کا محور ہے تو وہی انسان، لیکن یہ انسان شش جہت میں پھیلا ہوا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
میں نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

جوشؔ صاحب نے اس انسان کو "ہر رنگ میں دا" کیا ہے۔ وہ اس انسان کے ساتھ "شبنم" اور اس کے دشمن کے ساتھ "شعلہ" ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ انسان ......ارتقار کا پیشوا" اور "تہذیب کا پروردگار" ہے۔ جو "قندیلِ محرابِ شعور" ہے۔ "دانائے اسباب وعلل" ہے۔ "فاتح مستقبل دیواجل" ہے "گیتی شکن اور گردوں شگاف" ہے۔ جس کے "در جیب اہرمن" اور "یزداں در بغل" ہے جو "راکبِ تقدیرِ حیات و کائنات ہے۔ وہ اس انسان کو خانوں، گروہوں، قبیلوں اور مذہبوں میں تقسیم نہیں کرتے کیونکہ تقسیم انسان کو کمزور کرتی ہے۔ اور ہم آہنگی اور مفاداتی جڑاؤ انسان کو طاقتور بناتا ہے۔ منزلِ مقصود کو قریب لاتا ہے زمین پر رعنائیاں بکھیرتا ہے۔ امن کو دلدار اور "شیوہائے ہزار زندگی" کو محبت کے قومیتوں کا جزیرہ بنا دیتا ہے۔

اے طائرِ فکرِ بشر پر کھول بے خوف و خطر
ہاں اور کچھ پرواہ نہ کر وہ شمس ہے اور یہ قمر
وہ مشتری ہے یہ زحل
حیَّ علیٰ خیرِ العمل

اے آدمی نورِ احد اے کردگارِ مستتر
اے موجدِ حرفِ صمد اے خسروِ شامِ ابد
اے داورِ صبحِ ازل
حیَّ علیٰ خیرِ العمل

اے داورِ صبحِ ازل
حیّ علیٰ خیر العمل

اٹھ میکدے کی جان بن   ارض و سماں کی آن بن
رزّاق بن رحمان بن   اے آدمی انسان بن

تا چند یہ جنگ و جدل
حیّ علیٰ خیر العمل

اے شعلۂ احساں بھڑک   اے شیشۂ نفرت درک
اے سایۂ وحشت سرک   اے خوف کے اژدر دبک

اے موت کے لوہے پگھل
حیّ علیٰ خیر العمل

لعل و دُر و گنج و گہر   غیب و شہود و خشک و تر
اِن سب اے اہلِ نظر   صرف آدمی ہے معتبر

باقی ہیں سب لات و ہبل
حیّ علیٰ خیر العمل

ہاں اے اکائی کی ہوا   اعداد کے شعلے بجھا
اقوام کو واحد بنا   اِطلاق کے حلقے میں آ

کثرت کو وحدت میں بدل
حیّ علیٰ خیر العمل

ہاں پیشِ خاصانِ ادب   امراض ہیں رنگ و نسب
ہندی و افغان و عرب   اِک نسل سے ہیں سب کے سب

دِل کو جگا آنکھوں کو مل
حیّ علیٰ خیر العمل

اے عرش کے مشکل کشا   اے فرش کے فرماں رواں
انصاف کے جوہر دکھا   مظلوم کو سر پر بٹھا

ظالم کو تلووں سے مل

یا دوسرے مقام پر فرماتے ہیں حیّ علیٰ خیر العمل

تفریق جو سکھائے وہ تاریخ پھاڑ دے
جغرافیہ کا جنس دیریں اجاڑ دے
نقشوں کی نیش دار لکیریں بگاڑ دے
ایمان اور کفر کو دامن سے جھاڑ دے
للہ، افتراق کا دروازہ بند کر
اٹھ اور نوائے وحدت انسان بلند کر

اسی کے ساتھ ان کا شعلہ بار قلم جھکڑوں کو بادِ صبا، چلچلاتی دھوپ کو چاندنی اور ذروں کو آفتاب میں ڈھالنے کیلئے یوں آواز دیتا ہے۔

اس آدم فرسودہ کے زیر تخریب
اک آدم نو کی ہو رہی ہے تعمیر
کھیل ہاں اے نوع انسان سیاہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بجولاں ہے تو کیا
ختم ہو جائیگا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطح بزم امکاں ہے تو کیا
کل جواہر سے گراں ہو گی لہو کی بوند بوند
آج اپنا خون پانی سے بھی ارزاں ہے تو کیا

یا

بڑھے چلو بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو
بہ احترام وہ خم ہوئیں بلندیاں بڑھے چلو
لئے سلام جھک چلا وہ آسماں بڑھے چلو
فلک اُٹھے کھڑے ہوئے وہ پاسباں بڑھے چلو
یہ ماہ ہے یہ سحر ہے یہ کہکشاں بڑھے چلو
لئے ہوئے زمین کو کشاں کشاں بڑھے چلو

جوش صاحب انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہر تضاد سے ٹکراتے ہوئے ہر بت کو مسمار کر کے اسے موتی کی ایک لڑی میں پرونا چاہتے ہیں۔

دھرم ہے پانی من کی اینٹھن
بول اکتارے جھن جھن جھن جھن
پیر، پروہت، بھوگی، پاپا، پاپا
لوٹا، لٹیا، داڑھا، چٹیا
مندر، مسجد، گوپھا، گرجا
گھنٹی، ڈھولک، تاتا تھیا
یاہو یاہو، پوں پوں، ٹن! ٹن!
بول اکتارے جھُن، جھُن، جھُن جھُن
سب کے کاجل میرے پارے
سب کی آنکھیں میرے تارے
سب کی سانسیں میرے دھارے
سارے انسان میرے پیارے
ساری دھرتی میرا آنگن
بول اکتارے جھن جھن جھن جھن

جادو ٹونا، جنتر منتر
ناگ اور گائے، اونٹ اور خچر
چلنا ہے ان سب سے بچ کر
دین ہے پگلے سر کا چکر

میرے تن میں گلشن سب کے
میرے من میں جوبن سب کے
میرے گھٹ میں ساجن سب کے
سب کی صورت میرا درشن
بول اکتارے جھنن جھنن جھنن

حضرت جوش کا سلسلۂ نسب غالب کے گھرانے سے ملتا ہے ــــ غالب "جزو" میں "کل" "قطرے" میں "دجلہ" دیکھتا ہے ــــ جوش صاحب بھی "قطرے" میں "دجلہ" دیکھتے ہیں۔ وہ اس انسان کو جس کے ہونٹوں کی شادابیوں پر قفل سکوت لگا ہے۔ سروں پر گرم سلاخوں کے شامیانے تنے ہوئے ہیں جو پابند سلاسل ہیں اس میں انقلاب کی بجلیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں ــــ کیونکہ انھیں یہ یقین ہے کہ یہی انسان لافانی ہے۔ یہی مقدس اور شفاف انگلیوں سے خیر کی تخلیق کرتا ہے۔ یہی مونا لیزا کی مسکراہٹ، پکاسو کی مصوری، جولین فیبر چک کا شعلہ سا تمل، حافظ کے نغمے، ٹیگور کے گیت فراق و فیض کی شاعری موہن جداروں کے خطوط، ولدیت حسین خان کا زمزمہ، تھرکوا کے طبلے کی ٹکوریں امجد علی خان کے ستار کی چاندی سلامت علیخان کی خوش نوائی اقبال بانو کی غزل، استاد حفیظ خان کی نغمہ سرائی میں ڈھل کر خود آفتاب بن جاتا ہے۔

جوشؔ کے نزدیک اس حسن کا مالک صرف مسلمان ہی نہیں۔ دنیا کے تمام انسانوں کا اس پر حق ہے؛ ان کی شعلگیٔ فکر روحِ عصر سے متصل ہے۔ وہ نئی ترکیب معنوی سے "نیا جہانِ معنی" تخلیق کرتی ہے۔ جس کا رشتہ بین الاقوامی سرحدوں سے جڑ جاتا ہے۔ بالائی سطح پر جس طرح تمام استحصالی بین الاقوامی ادارے بلا تخصیص مذہب ملت و انسانی منڈیوں پر قبضہ جمانے متحد ہیں۔ اسی طرح عالمی سطح پر تمام محنت کش انسان اپنے طبقاتی مفادات کے مقدس رشتے میں پیوست ہیں۔

انسان خیر کی تخلیق کرتا ہے۔ زمانے کو زرِ خالص دیتا ہے۔ لیکن تعصبات کے ناگ، سرمائے کے خونی دیوتا سازشوں کے جال بچھا کر اس کے زرِ خالص پر اپنا خونی پنجہ کس طرح گاڑھتے ہیں۔ جوشؔ کی انقلابی بصیرت ان فتنوں پر سے یوں پردہ اٹھاتی ہے۔

محصور ہے معمورۂ ترتیبِ خیالات
اے حلقۂ صاحب نظراں، جاگتے رہنا
تھم تھم کے چمکتے ہیں در و بام پہ ناوک
رہ رہ کے کڑکتی ہے کماں، جاگتے رہنا
آمادۂ پیکار ہے فوجِ خزف و سنگ
لرزاں ہے جواہر کی دکاں، جاگتے رہنا
صوبوں میں کل اک دوڑ تھی، راہ سبقت پر
اب مشرق و مغرب ہیں دواں، جاگتے رہنا
اب خال و خط و رنگ پہ ہے جنگ کا آغاز
مردانِ رخِ امن و اماں، جاگتے رہنا

سن سن ہے خمکشی میں کہ رن بول رہا ہے
فتنے ہیں دبے پاؤں رواں ، جاگتے رہنا
ہاں آنکھ نہ جھپکے کہ ہے پتھراؤ کی زد پر
یہ کارگہِ شیشہ گراں ، جاگتے رہنا
پھر محتسبِ شہر ہے آمادۂ شبِ خون
اقطابِ خراباتِ مغاں ، جاگتے رہنا
اے چنگ و رباب و دف و قُلقُل کے امینو
اٹھنے ہی پہ ہے شورِ اذاں ، جاگتے رہنا
ہاں ، خُم کدۂ جوش میں جاکر یہ پُکارو
اے قبلۂ رندانِ جہاں ، جاگتے رہنا

انسان کی راہ میں بچھے ہوئے تمام جال وقتی و بے معنی ہیں۔ جوش کی عہد ساز شخصیت اس کو دیکھ رہی ہے۔

کھل رہا ہے وحدتِ اقوامِ عالم کا علم
آج انسان منکرِ توحید ہے انساں ہے تو کیا
آچکا ہے رونقِ فردا کا جنبش میں جلوس
آدمی کا خانۂ امروز ویراں ہے تو کیا
جوش کے افکار کو مانے گی دنیا
جوش کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رسوا یہ مردِ نامسلماں ، ہے تو کیا

آج فلسفۂ و تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ سائنٹفک نظریہ حیات کو سمجھنا لازم ہے سائنٹفک نظریہ سائنس کے میکانکی تصور کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ حالات و واقعات کو تاریخی اور مادی جدلیت کے قوانین کی روشنی میں چھان پھٹک کر پرکھنے کا نام ہے۔ اور یہ انداز نظر فن کار میں اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب ان کی فلسفۂ حیات پر گہری نظر ہوتی ہے فلسفیانہ گہرائی شاعری میں عظمت پیدا کرتی ہے۔ فلسفۂ حیات شاعر کے شعور کا جزو بنکر عملی زندگی کی صداقتوں کو اپنے دامن میں لے لیتا ہے۔ چونکہ ادب، مذہب اور تہذیب کی طرح فلسفے کی بنیاد بھی معاشی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ اس لیئے فلسفے اور تاریخ کو سائنٹفک طریقے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر ویڈ نیکسٹن نے اپنی کتاب scientific Attitude (سائنٹفک رویہ) میں اس پہلو کی طرف اس طرح نشاندہی کی ہے کہ عظیم شاعر کو بڑی اور عظیم شاعری لکھنے کیلئے ریاضت اور فن پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ ہر آن اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کے اقدار کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ "اگر آج انسان اپنی محنت کے کارناموں، سائنس کی برکات فریب اور بشارت دونوں سے آزاد ہوکر مستقبل کا ایک بہتر یقین پیدا کرسکتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ شاعری نئے یقین سے ہم آہنگ نہ ہو لیکن اس صورت میں اسے جذباتی تحریک کے ساتھ ساتھ ادراک کے طریق سے گذرنا ہوگا ......"

بڑی شاعری بڑے الفاظ سے نہیں بلکہ بڑے الفاظ کو معنی دینے سے ہوتی ہے۔ انھیں مزید الجھاتی نہیں بلکہ سلجھاتی ہے۔ سائنسی بصیرت کی بناء پر ایسی شاعری ذہن کی سچائی کی تصدیق ہوتی ہے جو کسی سماج کے

مادی ارتقاء اور شعور کے عمل اور ردعمل سے آگاہ ہیں۔ انھوں نے سیاست و ادب میں تصوریت و عنیت کے کانٹوں سے دامن بچایا۔ اردو ادب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنی معرکۃ الآرا، نظم "حرف آخر" میں زندگی کے تسلسل اور ارتقاء کی تاریخ قلمبند کر کے اردو شاعری کے فکری دھارے کو صحیح سائنسی سمت عطا کی۔ اس عظیم المرتبت نظم میں جوش نے مادے اور خیال کی کشمکش کو پیش کیا ہے اور اپنی توانا فکر اور آہنی دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کر دیا کہ۔ زندگی کی تابندگی "رقصندگی اور رخشندگی کی بنیاد فلسفۂ مادیت ہی پر ہے ارتقاء کی تصویر شاعر یوں پیش کرتا ہے۔

رنگ و بو کا یہ تماشا جس میں ہے یہ ریل پیل
زندگی کا جس میں کھیلا جا رہا ہے کب سے کھیل
یہ کرہ یہ آب و گل کی کارگاہ ہست و بود
قبل از پیدائش تاریخ ہے جس کا وجود
رقص میں کب سے ہے یہ رقاصۂ جادو ادا
ذہن میں آتا نہیں اندازہ ماہ و سال کا
عمر کیا ہے اس تماشا گاہ ابر و باد کی
غور کرتے وقت رک جاتی ہے سانس اعداد کی
یہ مہ و خورشید یہ سیارگان ہفتمین
اور ان کے ساتھ یہ گردندہ و غلطاں زمین
ایک ہی حجلے میں رقصاں تھے لب آتش جمال
جس کے گرد اگرد تھا لرزندہ اک شعلوں کا جال

اس کے بعد زمین کی تخلیق کی کہانی کا ورق یوں کھلتا ہے۔

صبر لیکن مدتوں کے بعد کام آ ہی گیا
تیرہ شب کو روز روشن کا پیام آ ہی گیا
مژدۂ ہستی لئے موج صبا آنے لگے
قلزموں نے ارغنوں چھیڑا زمین گانے لگی
اور پھر اک دلفریب و دلنشین انداز سے
خاک سے پودوں نے سر اپنے نکالے ناز سے
اور پھر سبزے کی جنبش سے زمیں لہرا گئی
اس ستارے کی مسیں بھیگیں، جوانی آ گئی
اور پھر کچھ تھم کے اٹھی ایک موج سرخوشی
قلزموں میں زندگی کی اولین جنبش ہوئی
خاک نے انگڑائی لیکر اپنے جوڑے کو چھوا
آئی سطح بحر سے میلاد خوانی کی صدا
زندگی کی طرفہ جنبش سے ہلی روح جمود
اولین مضراب سے لرزاں ہوا تار وجود
کونپلیں بن بن کے پھوٹے خاکداں کے ولولے
مچھلیوں کی شکل میں ابھرے ارادے بحر کے
کاہ کی نبض بھی زیر کہکشاں چلنے لگی
پانیوں پر سانس لیتی کشتیاں چلنے لگیں
دہر کے تاریک گوشے تک منور ہو گئے
زندگی کی سانس سے جھونکے معطر ہو گئے

زندگی کیا دولت بیدار ادراک و حواس
زندگی آواز اشارہ گیت آگاہی قیاس
زندگی موج شعور جوئے دانش زندگی
خسرو گردوں گرداں شاہ گیتی زندگی
زندگی تابندگی، رقصندگی، رخشندگی
شعلہ پرور، شعلہ پیکر، شعلہ افشاں زندگی
پر فشاں جناں رواں جولاں غزل خواں زندگی
اس ستارے کی امنگوں کی روانی زندگی
تند و طوفانی عناصر کی جوانی زندگے
منتشر تاریخ دنیا کی مؤلف زندگے
دین کے رنگین صحائف کی مصنف زندگی
زندگی سالار بحر و بر امیر برق و باد
دہر کا دل، خاک کی معراج، فطرت کی داد
میر عالم فاتح پیدا و پنہاں زندگی
گرد گار انبیاء، خلاق یزداں زندگی
سوچ تو کس منزل طوفاں سے آئی ہے حیات
کتنی قوتوں کو کچل کر مسکراتی ہے حیات
ابتدائی منزلوں کی بے پروبالی کو دیکھ
قہر افگن مادے کی ہمت عالی کو دیکھ

جوش صاحب کی یہ نظم جدید عہد میں سانس لے رہی ہے اس فکر سے چونک کر منہ پھیرنے کی بجائے اسے غور و فکر کا نقطۂ آغاز بنانے کی ضرورت ہے جوش صاحب ان تاریخ ساز اور عہد ساز فن کاروں میں سے ہیں جو حسن نظر، حسن خیال، حسن عمل کی سحر آفرینیوں کے اسباب و علل سے آگاہ ہیں اور ادراک و آگہی کے بل پر زندگی کے دامن میں چراغاں کرنا چاہتے ہیں ___ جوش نے اپنی استقامت نظر کی معجزہ سامانیوں اور آہنی دلائل کی روشنی میں ان چہروں کو دیکھا جو ہنوز مشاہدے میں نہیں آئے۔ ان پھولوں کی خوشبو سونگھی جو ابھی مہکے نہیں ہیں ان سازوں کی جھنکار سنی جنھیں ابھی مضراب نے چھیڑا نہیں ہے۔ ان جذبات کی ڈھڑکنوں کو گن لیا جنھوں نے ابھی دھڑکنا نہیں شروع کیا ہے اور ان واقعات کا مشاہدہ کیا جو سخت ڈنٹھل سے نکل کر کلی بننے اور پھول بن کر مہکنے کو ہیں۔

زہے جلالتِ دربارِ حضرتِ انسان
زمین ہے چتر بدست، آسماں عصا بردار
زہے پیمبری شعلہ ہائے فکرِ جدید
تمام دیوتا ایندھن، دھواں تمام اوتار
صنم کدوں میں کوئی یہ پکار کر کہہ دے
کہ ہو رہے ہیں بغاوت پہ برہمن تیار
جو، پائے وقت میں، دورِ کہن نے ڈالی تھی
پگھل رہی ہے وہ زنجیرِ سبحہ و زنار
بہا چکا ہے، زمین پر، جو خون کے دریا
قریب ختم ہے وہ دورِ کافر و دیں دار

حریم فکر سے رہ رہ کے آرہی ہے صدا
کہ علم و فضل بہت سہل، آگہی دشوار
اُتر رہا ہے، کبھی درا بیت و بُر ہال
بہ راہِ گوشش چڑھایا گیا تھا کل جو نجار
خوشا کہ فاصلہ اب بڑھ رہا ہے، روز بروز
میانِ منبرِ تبلیغِ عقل و تختۂ دار
خوشا کہ زیرِ سیوفِ برہنۂ فُقَہا
کھڑی ہوئی ہے بصدِ عزم، جرأتِ انکار
زمیں کو مژدہ کہ اب پختگی پہ مائل ہے
میانِ ذرّہ و خورشید، ذوقِ بوس و کنار
رکاب چوم رہے ہیں نجوم و شمس و قمر
یہ کون، توسنِ تو ہر پہ، ہو رہا ہے سوار
قدم قدم پہ بچھے جا رہے ہیں سرو سمن
یہ گلستاں میں در آیا ہے کون جانِ بہار
ہوا ہے کون یہ گرمِ خرام، نامِ خدا
اُبل رہی ہے رگِ سُرخ جادہ سے جھنکار
یہ چاہِ تیرہ سے، کس کی جبیں ہوئی ہے بلند
کہ غرقِ رنگ و تجلی ہے مصر کا بازار
یہ کس نگارِ دو عالم کی پیشوائی کو
چراغ اُٹھائے کھڑے ہیں ثوابت و سیّار

(آغازِ بیداری)

ہیں۔ جوش کی شاعری اس پوری نصف صدی پر حاوی ہے ـــــ اس مدت میں زمانے نے
کروڑوں رنگ بدلے۔ معاشی و معاشرتی سطح پر تغیرات رونما ہوئے ـــــ کاروانِ حیات
اس تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے کہ مڑ کر اپنا چہرہ دیکھنا ممکن نہیں۔ اس تیزی سے بدلتی، مچلتی
اور کروٹیں لیتی ہوئی دنیا میں اگر کوئی فنکار وقت کا ساتھ نہیں دے سکتا تو وہ سوکھا درخت
بن جاتا ہے ـــــ لیکن وہ فن کار جن کی فکر آہنی دلائل پر قائم ہے اور سماجی اسباب و علل
کی کڑیاں جوڑ کر نتائج اخذ کرنے پر قادر ہیں وہ کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ ـــــــــ

اردو ادب کی دنیا میں جوش وہ پہلا انقلابی شاعر ہے جس کی فکر کی بنیاد
دو ستونوں مادی فلسفۂ حیات اور "عقل پرستی" پر قائم ہے اس لئے اس کا
ہر حرف روشن، ہر سطر شفاف، اور ہر جملہ دُھلا ہوا ہے ـــــ ان کے خیالات
کا تدریجی ارتقاء ہے۔ ابتدائی اور آخری افکار میں داخلی ربط اور تسلسل ہے جو
ٹوٹنے نہیں پاتا ـــــ ابتدائے شباب کی داخلی کیفیت ہو یا حزن و تنہائی کا
احساس جو سماج میں اپنی جگہ نہ بنا سکنے کی صورت میں ابتداء میں ہر نوجوان میں
پیدا ہوتا ہے ـــــ عشق و محبت کی رنگ ترنگ ہو یا مظاہر فطرت کی رعنائی، رند
مشرب کا چھلکتا جام ہو عقل و وجدان کی بحث، افسردہ پھولوں کی کہانی ہو یا زنجیر کی
جھنکار، رومان کی خنک آسودگی ہو یا انقلاب کا سنہرا رخسار بیان کی ندرت ہو یا
رباعی کا اختصار زبان کی نغمگی ہو وہ زندگی کے ہر پہلو کی گرہ عقل و خرد کے ناخن
سے کھولتے ہیں۔ اسی لئے وہ بے ترتیبی میں ترتیب، بد سلیقگی میں سلیقہ اور
بد نظمی میں نظم تلاش کر لیتے ہیں ـــــ جوش صاحب کے یہاں قنوطیت نہیں
رجائیت ہے ـــــ فرار نہیں ٹھہراؤ ہے۔ خودسری نہیں تمکنت ہے۔ یاس
نہیں عاجزی ہے ـــــ بے یقینی نہیں یقین ہے۔ جمود نہیں حرکت ہے۔ کہکشاں
کی رنگت ہے باطنی کیفیت ایک ہے ـــــ مسلسل جستجو، مسلسل آرزو تخلیق کرتی

ہے نئی آرزو نئے عمل کی محرک بنتی ہے۔ نیا عمل تسخیر کائنات کا ضامن بنتا ہے ۔۔۔ لیکن یہ سب کن فیکوں پر ایمان رکھنے کی وجہ سے نہیں ہے ۔۔۔ بلکہ مادی فلسفہ حیات کی روشنی میں سماج کی سنگلاخ زمین کو گوڑنے میں، تازہ ہوا، اچھی کھاد اور روشنی فراہم کرنیکی بناء پر ہے ۔۔۔ یہ عمل اوپر کی مٹی کو نیچے اور نیچے کی مٹی کو اوپر کر دیتا ہے ۔۔۔۔ کسی بھی فن کار کی عظمت و بزرگی یہی تو ہے کہ اس کی بصیرت افروز فکر اپنے عہد کے شعور کے رگ و پے میں لہو کی گردش بن کر دوڑنے لگے اور اس کی بصیرت کے چراغ سے سینکڑوں چراغ جل اٹھیں اگر ایسا ہوتا ہے تو فنکار کی ماں کی دودھ سے نہائی ہوئی پیشانی پر فاتحانہ تبسم بکھر جاتا ہے ۔۔۔ فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری اور شیخ ایاز کروڑوں ان گنت شمعوں کا دہکتا ہوا ابھار زمین پر کھل اٹھتا ہے جو حضرت جوش کے حضور یوں نذرانہ پیش کرتا ہے۔

جوش صاحب" ہم آپ کی سائنسی فکر اور عقلیت پرستی کی آفتابی روایت کے ورثہ دار ہیں۔ آپ علم و آگہی کا درخشاں باب قوت گویائی کے سرمایۂ افتخار کشتیٔ فصاحت کے ناخدا" زبان کے شناور، ہچکیوں کے صداگیر ڈھلکتے آنسوؤں کیلئے شبنم اور تیرگی کے سامنے شعلہ ہیں۔

آپ نے کڑی دھوپ کو چاندنی میں ڈھالنے اور جھکڑوں کو باد صبا بنانیکی سعی میں سامراج کے بخیئے ادھیڑ دیئے خسروی کی پیشانی کو عرق ریز کر کے قوم کو آفتاب میں ڈھال دیا آپ اردو ادب کی دنیا کے پہلے سچے انقلابی شاعر ہیں۔ آپ نے آہنی استدلال اور سائنسی فکر پر جہل کے ریگزار سے کتنے ہی پتھر کیوں نہ برسیں لیکن آپ بصیرت کا چراغ ہمیشہ لو دیتا رہے گا۔